(محبت کی کہانیاں)
جاگتی
آنکھوں
کا
خواب
ابواللیث جاوید
Mir Zaheer Abass Rustmani
03072128068

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جاگتی آنکھوں کا خواب

ابواللیث جاوید

ہوتا ہے رازِ عشق و محبت انھی سے فاش
آنکھیں زباں نہیں ہیں مگر بے زباں نہیں

اصغرؔ گونڈوی

جاگتی آنکھوں کا خواب

(افسانے)

ابواللیث جاوید

اوراق پبلی کیشنز

Jagti Aankhon Ka Khawab (Short Stories)
by Abul Lais Javed
2nd Edition : 2013 Price Rs.: 200/-

نام کتاب : جاگتی آنکھوں کا خواب (افسانے)
مصنف : ابواللیث جاوید
پتہ : H-17, Ali Apartment, 2nd Floor, Abul Fazal Enclave, Jamia Nagar, New Delhi-110025 M.: 987307041
ناشر : اوراق پبلی کیشنز، دہلی
کمپوزنگ : خالد فیصل، 9899383815
سرورق : اظہار احمد ندیم
ناشر : اوراق پبلی کیشنز، نئی دہلی

ملنے کے پتے
- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اُردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔٦
- کتب خانہ انجمن ترقی، جامع مسجد، دہلی 011-23276526
- رائی بک ڈپو، الہ آباد۔ 09889742811
- کتاب دار، ممبئی۔ 022-23411854
- مرزا ورلڈ بک، اورنگ آباد۔
- بک امپوریم، اُردو بازار، سبزی باغ، پٹنہ۔۴
- ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ
- عثمانیہ بک ڈپو، کولکاتہ
- ہدیٰ بک ڈسٹری بیوٹرس، حیدرآباد

auraaque publications
A-170, Ground Floor-3, Surya Apartment, Dilshad Colony, Delhi - 110095 (INDIA)
Mob:9971775969,9899706640 Email: auraaquepublications@gmail.com

خوشتر گرامی کے نام

"اے میرے رب، میرے سینے کو میرے لیے کھول دے اور میرے
کام کو میرے لیے آسان کر دے، اور میری زبان کی گرہ کھول دے،
تا کہ لوگ میری بات سمجھیں۔" (سورہ طٰہٰ: ۲۵-۲۸)

ترتیب

دیباچہ—باتیں کچھ کہنے کی ۹
آئینہ سے ایک مکالمہ ۱۵
نیا موڑ ۱۹
گرتے گرتے ۲۷
اے غمِ دل کیا کروں ۳۳
کب صبح ہوگی ۴۱
روپ بہروپ ۴۹
گھر ہونے تک ۵۷
زندگی کہاں گزرے ۶۷
جاگتی آنکھوں کا خواب ۷۵
پیار کی روح ۸۵
پتھر کی زبان ۹۳
نیا آدمی ۱۰۳
فیصلہ کا درد ۱۱۱
واپسی ۱۱۷

بے گناہ ۱۲۵
دلِ ناداں ۱۳۳
چاند مدھم ہے ۱۴۱
سب سے بڑی خوشی ۱۴۷
نادانی ۱۵۳
آندھی ۱۵۹

Mir Zaheer Abass Rustmani
03072128068

دیباچہ

باتیں کچھ کہنے کی

اردو میں مختصر افسانوں کی روایت بیسویں صدی کے اوائل میں موردِ وجود میں آئی۔ انیسویں صدی کے آخری دور تک اُردو افسانہ طلسم ہوش ربا کی داستانوں اور مافوق الفطرت واقعات کی بھول بھلیوں میں الجھا ہوا تھا۔ بیسویں صدی کا آغاز ہی سماجی، سیاسی اور ثقافتی ماحول کے لیے نہایت ہی لرزہ خیز رہا۔ عالمی سطح پر ہی ایک نیا سیاسی منظر نامہ مرتب ہو رہا تھا۔ پہلی جنگ عظیم نے غربت، مفلوک الحالی اور سیاسی نظریوں میں تبدیلی کی داغ بیل ڈال دی تھی۔ جس کا براہِ راست اثر دنیا کی زبانوں کے ادب پر پڑا۔ اس تغیر نے ادباء و شعراء کو زندگی کے حقائق کی طرف متوجہ کر کے عوامی خیالات و نظریات کا ترجمان بنایا۔ اردو کا پہلا مختصر افسانہ سر سید احمد خاں کا افسانہ ''گذرا ہوا زمانہ'' تصور کیا جاتا ہے۔ بعد کے ادوار میں اردو افسانہ کا حتمی فارم دوسری دنیا کی بڑی زبانوں کے مختصر افسانوں سے تراجم کے ذریعہ طے پایا۔ اردو نثر میں رومانویت کا دور یہاں سے ہی شروع ہوتا ہے جبکہ امریکہ، فرانس، جرمنی اور انگلینڈ میں مدتوں قبل ہی شروع ہو چکا تھا۔ یہاں کے شعراء و ادباء کو کلیسائی اقتدار کے تحت اُن کی ذہنی آزادی جو میسر نہیں تھی، اُس کے خلاف صف آرائی کر کے پوری ذہنی آسودگی اور آزادی حاصل کر لی گئی۔ جو تخلیقات اقتدار کی مرضی کے خلاف ہوا کرتی تھیں، اُس کے تخلیق کار کو بخشا نہیں جاتا تھا۔ اس جنگ میں ورڈز ورتھ، کیٹس، شیلی جیسی شخصیتیں شامل ہوئیں اور آخر کار انھیں ذہنی آزادی

نصیب ہوئی۔ اس کے بعد سے ہی ادب میں Romanticism کا دور شروع ہوا۔ اردو ادب میں اس کی آمد ذرا تاخیر سے ہوئی، مگر ہوئی۔ سید سجاد حیدر یلدرم کے ترکی زبان کے ناول اور کہانیوں کے تراجم کے بعد سے یہ سلسلہ دراز ہوا۔ ان تراجم کا خیر مقدم نیاز فتح پوری جیسے قدر آور ادبی شخصیت نے کیا اور اس کے بعد اس کارواں میں مجنوں گورکھپوری، مہدی افادی، سجاد انصاری، ل احمد جیسے لوگ شامل ہو گئے۔ رفتہ رفتہ رومان انگیز تحریر اور شگفتہ لب و لہجہ سارے لوگوں نے اپنا کر اس رومانوی تحریک کو نہایت کامیاب بنادیا۔

فرانس کے صنعتی انقلاب (1760 تا1830) نے پورے یورپ میں ادبی طوفان برپا کردیا تھا۔ اس انقلاب سے صرف فرانسیسی ادب ہی نہیں، بلکہ امریکی، جرمن اور انگریزی ادب بھی بے حد متاثر ہوا۔ ۱۹۱۷ء میں روسی انقلاب بھی رونما ہوا جس سے روسی ادب بھی متاثر ہوا۔ اس انقلاب سے روسی ادباء جیسے پشکن، ٹالسٹائی، چیخوف، گورکی وغیرہ بہت متاثر ہوئے اور ان کی تخلیقات میں نمایاں تبدیلی نظر آئی، جو سیاسی نظریات، سماجی تبدیلیوں سے متعلق تھی۔ روسی ادب کا براہِ راست اثر اردو افسانوں پر بھی صاف صاف نظر آیا۔ منشی پریم چند پر یہ اثر اُن کے ایک خط مورخہ ۶ / مارچ ۱۹۴۲ء سے صاف ظاہر ہوتا ہے جو انھوں نے 'زمانہ' کانپور کے مدیر دیا نرائن نگم کو لکھا تھا۔ لکھتے ہیں:—

"مجھے ابھی تک اطمینان نہیں ہوا کہ کون سا طرز اختیار کروں۔ کبھی تو بنکم کی نقل کرتا ہوں .... جب سے ٹالسٹائی کے قصے پڑھ چکا ہوں تب سے اسی رنگ پر طبیعت مائل ہے۔" منشی پریم چند کے علاوہ سعادت حسن منٹو گورکی کے افسانوں کا ترجمہ کر کے شعوری و لاشعوری طور پر اس سے کافی متاثر تھے۔ منٹو کے افسانوں پر موپاساں اور چیخوف کے بھی اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ اسی طرح راجندر سنگھ بیدی چیخوف اور موپاساں سے خواجہ احمد عباس گورکی سے، کرشن چندر کافکا سے متاثر نظر آتے ہیں۔ ان کے علاوہ عصمت چغتائی، ممتاز شیریں، حسن عسکری، سجاد ظہیر وغیرہ۔ یورپ میں جو ایک سیاسی

انتشار نظر آیا اس سے نئے سیاسی نظریوں نے بھی جنم لیا۔ اور یہ تبدیلی سماج میں مروجہ رسم، طبقاتی ناہمواری، اقتصادی نابرابری کے خلاف تھی جس سے سچ پوچھئے تو اشتراکیت نے جنم لیا۔ اس کے اثرات ہمارے اردو ادب پر بھی بہت گہرے پڑے۔ سجاد ظہیر اور ان کے چند رفقاء نے اردو کے چند فنکاروں کو اپنا ہم خیال بنالیا اور 1936 میں منشی پریم چند کی صدارت میں ایک ادبی اجلاس منعقد کیا گیا جس میں ترقی پسند تحریک کی بنیاد رکھی گئی۔ حالانکہ قوم میں علمی، سماجی اور مذہبی بیداری کی مہم سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء کے ذریعہ کامیابی سے چل رہی تھی جسے علی گڑھ تحریک کہا گیا تھا۔ اس کا کوئی سیاسی منشور نہیں تھا، بلکہ علمی و اخلاقی سطح پر مسلمانوں کو ترقی دلانے کا مقصد پیش نظر تھا۔ اس تحریک سے مولانا حالی، علامہ شبلی نعمانی، ڈپٹی نذیر احمد جیسے عالم اور دانشور منسلک تھے۔

ترقی پسند تحریک ادب میں سیاسی نظریے کے ساتھ شروع ہوئی تھی۔ دراصل یہ یوروپی ممالک میں سیاسی و سماجی انقلاب کے ردِعمل کے طور پر ظہور میں آئی۔ اردو ادب میں نمایاں تبدیلیاں ۱۹۳۶ء کے اجلاس کے بعد نظر آنے لگیں۔ منشی پریم چند کے مطابق ــــــ ''ادب وطنیت اور سیاست کے پیچھے چلنے والی حقیقت نہیں بلکہ آگے مشعل دکھاتی ہوئی چلنے والی حقیقت ہے۔ یہ کیفیت (نگاہ میں وسعت) اس وقت پیدا ہوگی جب ہماری نگاہ حسن عالم گیر ہوجائے گی۔ جب ساری خلقت اس کے دائرے میں آجائے گی۔ وہ کسی خاص طبقے تک محدود نہ ہوگا بلکہ وہ فضا جو سارے عالم کو گھیرے ہوئے ہے تب ہی ہم بدمذاقی کے متحمل نہ ہوں گے۔''

یہی وجہ ہے کہ شروع میں اسے جواہر لعل نہرو، مولوی عبدالحق جیسے ادبی و سیاسی رہنماؤں کی سرپرستی حاصل رہی، مگر دھیرے دھیرے اس پر انتہا پسندوں کی گرفت مضبوط ہوتی گئی اور ترقی پسندی اشتراکیت کے ہم معنی ہوکر رہ گئی۔ اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ہنگامی ادیبوں نے ادب سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور کیفی اعظمی، جاں نثار اختر، وامق جونپوری، ساحر لدھیانوی اور مجروح سلطان پوری کی تخلیقات نظروں سے اوجھل ہونے

لگیں۔ منٹو، راجندر سنگھ بیدی جیسے لوگ بھی معتوب ہوئے لیکن وہ اپنی تخلیقی توانائی کی وجہ سے ہمیشہ فعال رہے۔ ۱۹۵۶ء میں حیدرآباد کی اردو کانفرنس اس لحاظ سے اہم ہے کہ ڈاکٹر عبدالعلیم اور سجاد ظہیر نے یہ اعلان کردیا کہ ترقی پسند تحریک اپنا تاریخی رول ادا کرچکی۔ اردو کے ادیبوں کو اب کسی ایسی تنظیم کی ضرورت ہے جس میں ہر نقطۂ خیال کے لکھنے والے ہوں۔

میرے خیال سے ترقی پسند تحریک دراصل سرسید اور حالی کی ادبی تحریک (علی گڑھ تحریک) کی توسیع تھی، اس فرق کے ساتھ کہ ان بزرگوں کے اقدام اصلاحی تھے اور ان نوجوانوں کے انقلابی۔

ترقی پسند تحریک کے اس اعلان کے قبل ہی ۱۹۵۲ء میں گوپال متل اور ان کے کچھ ہم خیالوں نے رسالہ 'تحریک' کا اجراء کرکے یہ اشارہ دے دیا تھا کہ سیاسی نظریات کے تحت ادب کی تخلیق صالح ادب نہیں ہوسکتا۔ جہاں طبقاتی کشمکش، مفلسی، ناداری، ظلم، استحصال جیسے مقاصد سامنے ہوں وہ ادب مقصدی ادب ہوجاتا ہے۔ اس لیے کھلے ذہن سے خارجی و داخلی کیفیات کے اثر سے جو ادب خلق ہوگا وہی سماج اور ملک کے لیے مفید ہوگا۔ گوپال متل کی ہم نوائی میں اچھے اور جینوین شعراء و ادباء کھڑے نظر آئے۔ اس طرح کم رفتاری سے ہی سہی ایک نئے حوصلے کی پذیرائی ہونے لگی۔ نعرہ بازی اور اشتراکی نظریات کی تخلیقات سے گریز دیکھنے میں آنے لگا اور اس طرح ایک نئی تحریک نے جنم لے لیا۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے رسالہ ''شب خون'' کے ۱۹۶۶ء کے اجراء نے اس نئی تحریک پر مہر ثبت کردی اور اس طرح ''جدیدیت'' کی شروعات ہوئی۔

''جدیدیت'' نے اردو شاعری کو ایک بالکل نئی زبان سے روشناس کرادیا اور افسانوں سے کہانی پن اتار پھینکی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شاعری میں استعارے، علامتیں، اشارے کنائے سب بدل گئے اور کہانیوں سے پلاٹ، کردار کے نام اور ماجرا سازی ختم ہوگئی۔ کہانیاں معمہ کی حد تک اجنبی ہوگئیں اور شاعری 'مرغے کی چونچ میں سورج'' والی

شاعری ہوگئی۔ اس دور میں لکھنے والوں کی ایک بھیڑ جمع ہوگئی۔ ناقدین فن کے بھی خیمے تیار ہو گئے۔ کچھ نے اس انداز کو بہت سراہا اور کچھ نے تو ان تمام تخلیقات کو ادب سے خارج کر دیا۔ آخر کار ۱۹۸۰ء کی دہائی نے پھر ایک کروٹ لی اور کہانیوں میں سپاٹ اور بیانیہ انداز در آیا۔ اسے 'مابعد جدیدیت' کا دور کہا گیا۔ اس کو پروفیسر گوپی چند نارنگ جیسے دانشور کی حمایت حاصل ہے۔ اس دور کو اردو ادب کے لیے ایک نہایت مہذب اور سنجیدہ دور کہا جا سکتا ہے۔

یہ تھا اردو ادب کے سفر کا ایک مختصر سا جائزہ۔ میں نے افسانہ نگاری اپنے طالب علمی کے زمانے سے ہی شروع کر دی تھی۔ کالج کی میگزین اور دیگر نیم ادبی رسالوں میں شروع کی تحریریں شائع ہو چکی تھیں۔ میرا پہلا باضابطہ افسانہ 'بے گناہ' دھنباد سے شائع ہونے والے ماہنامہ 'جام نو' کے پہلے شمارے بابت ماہ دسمبر ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا تھا۔ ماہنامہ 'بزم ہند' آسنسول اور ماہنامہ 'زیور' پٹنہ میں بھی کچھ افسانے شائع ہوئے۔ اس زمانہ کا معروف اردو ماہنامہ 'بیسویں صدی' دہلی کے سالنامہ جنوری ۱۹۷۰ء میں میرا افسانہ 'نیا موڑ' شائع ہوا۔ یہ افسانہ بہت مقبول ہوا اور یہاں سے ہی بیسویں صدی دہلی کے علاوہ ملک کے دوسرے اہم رسالوں جیسے 'شاعر' بمبئی، 'آہنگ' گیا، 'تحریک' دہلی، 'نشانات' مالیگاؤں، 'الفاظ' علی گڑھ، 'زبان و ادب' پٹنہ، 'اسباق' پونا، 'فن کار' حیدرآباد، 'قرطاس' ناگپور، 'گلبن' احمد آباد، 'شیرازہ' سرینگر، 'مباحثہ' پٹنہ وغیرہ میں میری تخلیقات مستقل شائع ہوتی رہیں۔

میرا پہلا افسانوی مجموعہ 'کانچ کا درخت' ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا جس میں اس وقت کے تقاضہ کے مطابق تیرہ علامتی افسانے شامل تھے۔ ۱۹۸۰ء کے بعد لکھے گئے افسانوں کا مجموعہ میں نے ترتیب دے دیا تھا مگر اسے شائع کرانے میں بہت سی مشکلات سامنے آئیں جو زیادہ تر میری ذاتی تھیں، جس کا بیان عبث ہوگا۔ آخر کار میں اس قابل ہو سکا کہ مجموعہ شائع کرا سکوں۔ اس لیے ۱۹۸۰ء کے بعد کے دور جسے 'مابعد جدیدیت'

کہتے ہیں، کے بھی چند افسانے شریک کر کے تقریباً ۲۳ رافسانوں پر مشتمل افسانوں کا مجموعہ 'کنارے کٹ رہے ہیں' ۲۰۱۳ء میں شائع ہوا۔ میرے چند مخلص احباب کا برابر اصرار رہا کہ پہلے دور کے وہ افسانے جو علامتی و تجریدی افسانوں سے قبل لکھے گئے ہیں، اس کی افادیت اور اہمیت ہی الگ ہے۔ زبان و بیان کے علاوہ افسانے کچھ نہ کچھ پیغام کے متحمل ہوا کرتے تھے، اُن افسانوں کی شگفتہ اور شیریں زبان آج تک لوگ بھولے نہیں ہیں۔ اس لیے میرے افسانوں کا یہ تیسرا مجموعہ 'جاگتی آنکھوں کا خواب' آپ کے ہاتھوں میں ہے گو کہ اسے میرا پہلا افسانوی مجموعہ ہونا چاہیے تھا۔ اس مجموعہ میں شامل ۱۹ رافسانوں میں صرف دو افسانے 'سب سے بڑی خوشی' اور 'آندھی' حالیہ دور کے افسانے ہیں۔ ان افسانوں کے تقابلی مطالعہ سے زبان کا فرق ضرور محسوس ہو جائے گا۔ یہ افسانوی مجموعہ میرے لیے اس لیے بھی اہم ہے کہ میرا پہلا افسانہ 'بے گناہ' اس مجموعہ میں شامل ہے۔

اس مجموعہ میں شریک تمام افسانے مجھے عزیز ہیں، اگر آپ اپنی گرانقدر آراء سے مجھے مطلع کر سکیں تو ممنون ہوں گا۔

ابواللیث جاوید

آئینہ سے ایک مکالمہ

'روز مجھ میں اپنی صورت دیکھ کر
فخر کرتے ہو یا افسردگی
گھیر لیتی ہے تمھیں'
میں نے پوچھا— "آج تم کو
یہ سوالوں کا نشہ کیسے ہوا"
مسکرایا اور یوں گویا ہوا
"تم کو جب میری کسی عادت
کسی فطرت کی
کوئی خبر ہی نہیں
حالانکہ
تم روز مجھ سے روبرو ہوتے ہو
صرف اپنی صورت، اپنی سج دھج
دیکھ کر
مسکراتے رہتے ہو
میرے اندر بھی کبھی دیکھا، کبھی جھانکا؟

فطرتِ انسان تو بس یوں ہی سی ہے
خود سکھی —دنیا سکھی— بس اور کیا
تم میں تو خود کو دیکھنے کی بھی
کوئی قدرت نہیں، کوئی طاقت نہیں
میں نہ ہوتا تو تم خود سے بھی
کبھی آشنا نہ ہوتے جناب"
اس کی باتیں مجھ کو بس
برافروختہ کرتیں رہیں
کچھ نہ بن پایا تو میں نے
زور سے
ایک پتھر اُس کے چہرے پر جڑ ہی دیا
ٹکڑے ٹکڑے ہو کے بھی
فرش پر بکھرا مجھ پہ ہنستا ہی رہا
اور بولا ——
"خواہ میں کتنے بھی ٹکڑوں میں بٹوں
تم کو ہی تیری ہزاروں طرح کی
شکلیں دکھاتا جاؤں گا
تا کہ تم خود کو تو پہچان لو
ہے بزرگوں نے کہا کہ
خود شناسی کے لیے آئینہ کے سامنے
بیٹھو اور خود غور کرو

مجھ کو توڑو گے تو تم خود
بے اماں، بے سمت ہی ہو جاؤ گے
میں زمانہ کو اس کی شکل دکھلاتا تو ہوں؟"
مجھ کو تم اپنے تحفظ کے لیے
زندہ رکھو ورنہ خود

تیرا وجود،
تیرے ہاتھوں سے نکل ہی جائے گا۔
میں تو آئینہ ہوں
ٹکڑوں ٹکڑوں میں تمھیں،
تمہاری تمام شکلیں دکھاتا جاؤں گا

Mir Zaheer Abass Rustmani
03072128068

نیا موڑ

راج ٹرانسپورٹ کی ''میگھ دوت'' نرالے بانکپن، اچھوتی دلکشی اور سبک خرامی سے سڑک کی چوڑی کالی چھاتی پر پھسلتی جارہی تھی۔ بارش ابھی ابھی تھمی تھی اور فضا میں قدرے نمی سو گئی تھی۔ رانچی کا شہری علاقہ ابھی ختم نہ ہو پایا تھا، اونچی اونچی عمارتیں، آکاش وانی، سرکاری کوارٹرز سب ہی بارش میں نہا چکے تھے۔ 'میگھ دوت' کا اندرونی ماحول بہت ہی خوشگوار اور پُرسکون تھا۔ سیٹوں کے مطابق ہی مسافروں کی تعداد تھی۔

وہ بس میں جیسے ہی داخل ہوئی، اندرونی ماحول میں کھلبلی سی مچ گئی۔ سبھی لوگوں کی نگاہیں اس پر مرکوز ہو گئیں۔ اس کا بوٹا سا قد، گلابی رنگت، شرابی آنکھیں، ناگن سی بل کھاتی ہوئی زلفیں، چست مہریوں والی شلوار، کولہوں کو نمایاں کرتا ہوا چست جمپر، نوکدار نیا گرہ، گردن میں لپٹا ہوا مختصر سا دوپٹہ، ماتھے پر پھیلے ہوئے بالوں کی جھالر یہ سب مل کر قیامت برپا کرنے کے لیے کافی تھے۔ وہ جیسے ہی بس میں داخل ہوئی سارا ماحول عطر بیز ہو گیا۔ سبھی مسافر ایک دوسرے کی نظریں بچا کر اسے دُزدیدہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ ادائے بے نیازی سے بڑھتی گئی اور جس جس سیٹ سے گزری وہاں بیٹھے ہوئے مسافر نے اسے دعوتی نگاہوں سے دیکھا۔ بڑھتے بڑھتے وہ لیڈیز سیٹ سے بھی آگے نکل گئی اور سب سے اگلی سیٹ تک پہنچ گئی، جو ابھی تک خالی پڑی تھی۔ اپنی اٹیچی اُس نے سیٹ کے نیچے رکھ دی اور بہت اطمینان سے سارے ماحول کا طائرانہ جائزہ لے کر سیٹ کے کوشین میں دھنس سی گئی۔

بس جو تھوڑے وقفے کے لیے تھمی تھی سرک پڑی۔ وہ بہت دیر تک کوشین میں دھنسی رہی۔ 'میگھ دوت' کی رفتار سے جو ہلکا ہلکا جھٹکا اس کے سارے وجود پر لگ رہا تھا اسے بہت ہی خوشگوار اور کیف آور معلوم ہوا اور اُس نے اپنے کسکتے ہوئے جسم میں ایک گدگدی محسوس کی۔ وہ بہت دیر تک آنکھیں موندے جھٹکوں سے لطف لیتی رہی۔ جب اس نے آنکھیں کھولیں تو باہر بارش ہو رہی تھی۔ بارش کی رِم جھم میں وہ کھو سی گئی۔

یادوں کے آئینے میں عکس ابھرنے لگے۔

ایسی ہی رم جھم کرتی ہوئی شام کو جب وہ گیا اسٹیشن پر پی جی سے اتری تھی، وہ وِکرم سے جا ٹکرائی تھی۔ اس کے ہاتھ میں تھما ہوا بیگ چھوٹ گیا تھا اور وہ پلیٹ فارم پر اپنے بکھرے ہوئے ٹاول، پاؤڈر کیس، کریم، کیوکارین، لپ اسٹک، شیمپو، کانٹا، ڈائری، کتابیں اور خطوط اکٹھا کرنے میں منہمک ہو گئی تھی۔ وکرم سکتے کے عالم میں خاموش کھڑا اسے تکتا رہا۔ اس کا ملکوتی حسن بارش کے قطروں میں ڈھل کر شبنمی ہو گیا تھا۔ جب اس نے اپنی شربتی آنکھیں اوپر اٹھائیں تو وکرم صرف اتنا کہہ سکا۔

''معاف کریں گی—! غلطی میری نہیں تھی—!!''

اور وہ جواب دیے بغیر شانِ بے نیازی سے اپنی زلفیں جھٹکتی پلیٹ فارم کی بھیڑ بھاڑ میں گم ہو گئی۔ وکرم دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ خواب و خیال کی دنیا سے یکا یک دھرتی پر گر پڑا ہو۔

وہ لپکا اور بھیڑ کو چیرتا ہوا اس کے قریب پہنچ ہی گیا۔ وہ ریلوے برج کی آخری سیڑھیاں طے کر رہی تھی۔ وکرم نے پیش قدمی کی اور بہت بے تکلفانہ انداز میں بولا:

''آپ کو تکلیف تو نہیں ہوئی—؟''

''جی نہیں۔'' اس نے بہت بے باکی سے جواب دیا اور زیرِ لب مسکرا دی۔

وکرم نے اُس کے مزاج کی نرمی بھانپ لی اور شگفتگی کی خوشبو سونگھ لی اور پھر بولا:

''آپ کا کوئی ہم سفر بھی ہے۔؟''

''میرے ہم سفر تو چاند ستارے ہیں۔! سارے نظارے ہیں!!'' وہ خالص فلمی انداز میں بولی۔

وکرم سے نہ رہا گیا اس نے فوراً کہا۔ ''گویا چاند کا ہم سفر چاند۔!''

''باتیں تو بہت خوبصورت کرتے ہیں آپ!''

''خوبصورت کے قریب آ کر ہر چیز خوبصورت ہو جاتی ہے!''

وہ جواب میں صرف ادائے دلبری سے مسکرا دی۔ گیٹ سے باہر تک دونوں خاموش رہے۔ جب وکرم رکشا پر سوار ہو گیا تو ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی تھی وہ جاتے ہوئے رکشا کو دور تک تکتی رہی جس میں وکرم کا لہراتا ہوا ہاتھ نظر آ رہا تھا۔ سشما نے ایک عجیب سی کسک محسوس کی۔! عجیب سی خلش! عجیب سے چبھن۔ نہ جانے کیوں۔!!!

'میگھ دوت' ایک جھٹکے کے ساتھ پہاڑی راستے طے کرتی ہوئی مڑی اور اس کی یادوں کا شیرازہ بکھر گیا۔ رام گڑھ کول مائینس کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور دیکھتے دیکھتے کنٹونمنٹ کے خوبصورت کوارٹرز، پریڈ گراؤنڈ، ریلوے کوارٹرز اور بازار کی بلند عمارتیں یکے بعد دیگرے نکل گئیں۔ 'میگھ دوت' جب بڑالو پر رکی تو موسم بہت ہی خوشگوار ہو چکا تھا۔ اس کا جی چاہا نیچے اُتر کر تھوڑی دیر چہل قدمی کرے مگر وہ ایسا نہ کر سکی۔ اسے یاد آیا جب وکرم اور وہ کشمیر گئے تھے، تب امرناتھ جاتے ہوئے بس کے پہاڑی سفر میں ایک جگہ دونوں بس سے اترے تھے۔ وہ جگہ کتنی خوبصورت تھی، پہاڑی ڈھلوانوں پر پیچ و خم کھاتی ہوئی سڑک، چیر، ساگوان اور یوکلپٹس کے لمبے لمبے درخت، پھولوں سے بھری وادیاں، پہاڑوں سے ابلتے بل کھاتے صاف و شفاف پانی کے چشمے، دور تک پھیلی ہوئی ہریالی میں کتنا حسن تھا، کتنی رعنائی تھی، وکرم نورا کی سرائے میں کافی، انڈے اور کھانے کا دوسرا سامان لیتا رہا اور وہ اُن نظاروں میں بالکل کھو سی گئی تھی۔ جب وکرم سارا سامان لے کر باہر آیا تو سشما غائب تھی۔ وہ کتنا پریشان تھا، کتنا مضطرب تھا۔ جب سشما پر نگاہ

پڑی تو وہ چپکے چپکے اس کے قریب آیا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کی آنکھیں موند لیں۔ سشما سمجھ گئی وکرم ہے۔ جب وکرم نے آنکھوں سے اپنے ہاتھ ہٹائے تب اس نے بے اختیار وکرم کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

سانسوں کی گرمی، آنکھوں کی روشنی اور دل کی دھڑکنوں میں وکرم سرایت کر چکا تھا۔ خوابوں کی ویران سی محفلوں میں وکرم نغمہ سرائی کر رہا تھا۔ سنگیت کی مدھر راگنی جاگ اٹھی تھی، جس کی مدھر لَے پر سشما کی زندگی ناچ اٹھتی تھی۔ سشما نے اپنے من مندر کے دیوتا کے قدموں میں اپنی پھول سی کومل زندگی کے ہار کو ارپن کر دیا تھا۔ خوابوں کی حسین دنیا مہک اٹھی تھی۔

دونوں نے اس حسین رات کے دلنواز لمحات وہیں گزارے، جہاں اُن کی سانسیں ہم آہنگ ہوئی تھیں۔ وہ رات — زندگی کی اہم ترین رات — ایک یادگار رات بن گئی تھی — !! جب وہ لوٹے تو کشمیر وِکرم کی آنکھوں میں بسا رہا اور سشما کی آنکھوں میں صرف اُسی رات کا سپنا جھلملاتا رہا اور خیالوں میں اس رات کی کہکشاں اُس کی مانگ میں سیندور سجاتی رہی، تارے افشاں پاشی کرتے رہے اور دور ملگجے آسمان پر چمکتا دمکتا سا چاند ماتھے پر جھومر سجاتا رہا اور ساری فضا شادیانے بجاتی محسوس ہوتی رہی۔ سشما لجائی شرمائی دلہن سی بنی کسی اجنبی کے قدموں کی چاپ پر لرز اٹھنے کے لیے بے قرار سمٹی سمٹائی بیٹھی رہی۔ دل کی یہ کیفیت قدرتی تھی، جو ہر عورت کی سب سے حسین خواہش کی عکاس ہوتی ہے۔

'میگھ دوت' جب جھٹکے کے ساتھ تیز رفتاری سے مڑی تو سشما کے خیالات کا تسلسل منتشر ہو گیا۔ ہزاری باغ کا ہارن گنج، سینٹ کولمبس کالج، چرچ، جی پی او، سول کورٹ پھر بازار دیکھتے دیکھتے سرکتے گئے۔ بس اسٹاپ پر تھوڑے وقفے کے لیے رکی۔ ہزاری باغ کی صاف ستھری سڑکیں، قرینے کی عمارتیں اور آراستہ بازار اور پرسکون شہری ماحول نے سشما کے دل ودماغ کو فرحت سی بخشی۔ اسے شہر کی مشغول ترین زندگی، گہما

کبھی، شور شرابہ اور ہنگامہ خیزیوں سے عجیب سے گھٹن محسوس ہوتی تھی۔ اس کا ذہن اب اس سے فرار چاہتا تھا۔ اسے ذہنی سکون کی تلاش تھی۔ اسی سکون کی جستجو میں وہ شہروں شہروں گھومتی رہی۔ وکرم نے اس کی ہر خواہش پر اپنی فراخ دلی کا پورا پورا ثبوت دیا۔ الور اور اجنتا کی گپھاؤں میں پہنچ کر وہ ماحول کی مدھر راگنی میں گم ہوگئی۔ ہواؤں میں تحلیل صدیوں صدیوں کی کہانیاں، حسن و عشق کی تابندگی سے لبریز پتھروں کے گیت اور پتھروں کے سینے میں دھڑکتے، جیتے، جاگتے دلوں کی دھڑکنیں اسے صاف سنائی دے رہی تھیں۔ خیام کی رباعیوں کا تقدس، شیلی اور کیٹس کی نظموں کا حسن، غالب اور اقبال کی غزلوں کی لطافت تمام پتھروں کے لبوں پر جیسے مچل رہی تھی۔ اُن پتھروں پر پھیلے تمام نقوش پر زندگی کی گہری چھاپ دائم وقائم تھی۔ وہ اس درجہ انہماک سے اُن پتھروں کی دنیا میں کھوگئی کہ اسے محسوس ہوا جیسے وہ بھی اجنتا کی کوئی اپسرا ہو، جو گوشت پوست کی جیتی جاگتی عورت بن کر باہر چلی آئی ہو۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے بدن میں پر لگ گئے ہوں۔ وہ سارے ماحول پر اڑتی رہی، خوبصورت رنگ برنگی تتلی کی طرح اور وِکرم اسے پکڑنے کے لیے چھوٹے بچے کی طرح مچلتا رہا۔ دھیرے دھیرے دبے دبے قدموں سے وہ وہاں پہنچ جاتا جہاں جہاں یہ تتلی پتھر کے کسی پھول پر ایک لمحہ کے لیے بیٹھتی لیکن جیسے ہی بچہ اپنی انگلیوں کا جال بنائے تتلی کو پکڑنا چاہتا، وہ اڑ چکی ہوتی۔ وہ پھر مچل جاتا۔ مگر اس کی متجسس نگاہیں اسے ڈھونڈ ہی لیتیں، تتلی کو اس بچے پر بہت ہی پیار آگیا اور وہ دانستہ طور پر ایک مقام پر رک گئی۔ جب بچے نے اسے پکڑ کر خوشی سے شور مچایا تو تتلی کا جیسے خواب ٹوٹ گیا۔ سشما کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے اور وکرم نے اسے اپنی گود میں اٹھالیا اور گپھا سے باہر کی طرف دوڑ پڑا۔ سشما کے بڑھتے قدموں کو اگر وِکرم اس طرح روک نہ لیتا تو وہ ایک زہریلے سانپ کے ساٹھے ہوئے پھن سے جاٹکراتے! پھر کیا ہوتا خدا جانے—!

''وکرم! مجھے کچھ ہو جاتا تو—؟!'' سشما نے اپنی گھنیری زلفیں وکرم کے شانے پر پریشان کرتے ہوئے پوچھا۔

"شش۔۔ش۔۔۔ش۔۔۔" وِکرم نے اپنا ہاتھ سشما کے گلابی لبوں کی پنکھڑیوں پر رکھ دیا اور بہت ہی رازدارانہ انداز میں کہا۔۔ "ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔۔!!" وہ سرگوشیوں کے انداز میں کہہ رہا تھا۔'اجنتا کے نقوش نے ہمیشہ پیار کو نئی زندگی دی ہے، لی نہیں ہے!'

وکرم کے سینے سے لگی وہ آنکھیں موندے پیار کے آسمان کی وسعتوں میں ہچکولے کھاتی رہی۔ وکرم کے دل میں اس کے لیے کتنا پیار تھا۔ اس پیار کے تصور ہی سے اُس کی زندگی جھوم جھوم اُٹھتی۔

سفر کے آخری لمحات میں جب تاج کے حسن کو اُس کی نگاہیں چوم رہی تھیں اور دل بارگاہِ عشق میں سجدہ ریز ہورہا تھا، سشما نے محبت کی اس عظیم یادگار کے آگے اپنی محبت کا حلف من ہی من میں لیا اور وِکرم کی طرف انجانے میں دیکھا۔ وہ بھی اُس کی طرف دیکھ کر مسکرایا جیسے دل ہی دل میں حلف لیتے وقت اُس کی چوری پکڑی گئی ہو اور دونوں ایک بار پھر اپنی مسرتوں کے جہان میں کھو سے گئے۔ سشما کے خیالات کی آنکھوں نے دیکھا، مغل شہنشاہ شاہجہاں کسی غم کے سمندر کی عمیق گہرائیوں میں پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ یہ غم تھا جدائی کا، اپنی ملکہ کی جدائی کا! لڑکھڑاتے قدم، تمتمایا چہرہ اور بے تاب کیفیتِ دل اسی عظیم غم کی غماز تھی۔ سارا عالم سوگوار اور ماتمی ہورہا تھا۔ محبت کی آنکھوں سے خونِ جگر کے آنسو ٹپک رہے تھے۔ موتیوں کا ڈھیر سا لگ گیا تھا، جن کی چمک سے آنکھیں خیرہ ہورہی تھیں۔ زمانہ کے دامن میں یہ موتی اکٹھے ہوتے رہے اور کسی خوبصورت سے لمحے میں ان موتیوں نے محل کی شکل اختیار کر لی جس کے در و دیوار سے محبت کی خوشبو آنے لگی۔۔!! اور یہی خوشبو سارے عالم میں پھیل کر ایک شہنشاہ کی محبت کی عظمت کہلائی۔ وہی محبت جس پر تاج محل تو کیا ساری دنیا کی تخلیق کا خیال وجود میں آیا ہوگا!

'میگھ دوت' جب شیر گھاٹی کے ڈھلوانوں پر تیز رفتار ہوئی تو کھڑکیوں سے آتی

بارش کی بوندوں نے سشما کو چونکا دیا۔ اس کے خیالات کا شیش محل زمین بوس ہوگیا۔ سفر کی تکان سے سارا بدن چور سا ہو رہا تھا۔ سشما کوشن پر دراز ہوگئی مگر اُس کے مضمحل دل و دماغ کو سکون نصیب نہ ہوا۔ یہ ذہنی کیفیت وکرم کے ایک خط کا نتیجہ تھی، جو اس نے سشما کو کلکتہ سے لکھا تھا۔ بالکل غیر متوقع طور پر ـــ اس نے لکھا تھا ـــــ

سشما!

جوانی بہتی دریا ہے۔ آج اِدھر تو کل اُدھر! تم نے بھی اِسے اِسی زاویۂ نگاہ سے دیکھا ہے۔ یہ وسیع النظری سچ پوچھو تو ہمارے ماڈرن ٹائمز (Modern Times) کی دین ہے، اُس کی بلندی ہے۔ میں اگر کہوں کہ میں یہاں Engage ہوگیا ہوں تو شاید تم برا نہ مانو گی۔ جہیز کی بھاری رقم بھی تو آخر کوئی چیز ہوتی ہے؟

اچھا بائی بائی ــــ!

تمہارا اب نہیں

وِکرم

سشما پر جیسے بجلی گر پڑی تھی۔ وہ اس غم کی تاب نہ لا سکی تھی۔ ہو سکتا تھا وہ کچھ کر بیٹھتی مگر جدید تہذیب کی بلندیوں نے اس کی مسیحائی کی۔ اس نے سوچنے کا انداز یکسر بدل ڈالا۔ اس نے سمجھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ وقت کے مرہم نے بھی اس کے زخموں کو مندمل کر دیا تھا۔

جب 'میگھ دوت' گیا پہنچی تو سشما اتر چکی تھی، مگر اس کا خوبصورت اٹیچی سیٹ کے نیچے چھوٹ گیا تھا۔ کنڈیکٹر نے جب یہ بات مسافروں پر ظاہر کی تو دو نوجوان مسافروں نے اسے اپنا بتایا۔ معاملہ کوتوالی تک پہنچا دیا گیا۔ دونوں دعوے داروں سے اٹیچی کے اندر بند سامان کی فہرست مانگی گئی۔ دونوں نے فہرستیں داخل کیں۔ کوتوال کی نگرانی میں جب اٹیچی کھولی گئی تو سبھی حاضرین کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اٹیچی سے

ایک نوزائیدہ بچے کی لاش برآمد ہوئی۔ دونوں نوجوانوں کو گرفتار کرلیا گیا!
کون جانے یہ ماڈرن ٹائمنز کی بلندی تھی یا پستی —! اس کی فتح یا شکست —!!
زندگی کے نئے موڑ پر سشما اس طرح مطمئن تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو!!!

■❖■

گرتے گرتے

اپنے جیون کے سونے پن کا احساس مجھے گدگداتی سی اُس شام کو ہوا ہے، جس شام رضیہ کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس کی ہنسی کی دبی دبی سی آواز پر میرے قدم خود بخود رک گئے تھے اور کان کمرے کے اندر سے آتی ہوئی سرگوشی سننے کے لیے بے تاب ہو گئے تھے۔ میں سانس روکے دیر تک کھڑی رہی۔ لیکن کوئی بات واضح سنائی نہ دی۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا اور پورے جسم میں کپکپی سے ہو رہی تھی۔ رضیہ کی چوڑیاں بجنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میرے دل میں گدگدی سی ہو رہی تھی، نہ جانے کیوں — لیکن یکا یک مجھے اپنی اخلاقی پستی کا خیال آ گیا۔ کوئی دیکھ لیتا تو کیا کہتا——!؟

مجھے اپنی چھوٹی بہن کے کمرہ کی آہٹ سننے کے لیے اُس کے سامنے اِس طرح کھڑی نہ ہونا چاہیے تھا۔ جب کہ میں یہ جان رہی تھی کہ اُس کا نیا نویلا دولہا کمرے میں موجود ہے۔ مجھے خود بخود بے حد خجالت ہوئی اور میں فوراً اپنے کمرے کی طرف بھاگی اور اپنے بستر پر گر کر بری طرح ہانپنے لگی اور دیر تک اپنی بکھری ہوئی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ میری زندگی کتنی ویران، کتنی بے کیف اور کتنی خشک ہے۔ میں دیر تک سوچ کے گہرے سمندر میں ڈوبی رہی ہوں۔ میرے کنوارے ارمان یکبارگی جاگ اٹھے ہیں اور سپنوں کی رہ گزر پر کسی ہم سفر کی چاہت کی کلیاں شگفتہ ہو اٹھی ہیں۔ میرے ذہن میں پیار کے ایک شہزادے کا جو خاکہ بن چکا تھا وہ

مچل اٹھا ہے۔ مجھے ایک چاہنے والے کی، ایک رازدار کی کمی محسوس ہونے لگی ہے۔ میں سوچتی چلی گئی ہوں ـــــ 'بابل کے گیت اور شہنائیوں کی تان کے درمیان جب رضیہ کی ڈولی اٹھی تھی تو اُس دن بھی میرے دل میں ایک ہوک سے اٹھی تھی اور اُس دن بھی ایک عجیب سے حسرت نے میرے دل کے نہاں خانوں میں سر ابھارا تھا۔ نہایت مایوس کن اور روح فرسا سی حسرت نے ـــــ کاش میری بھی شادی ہو جاتی ـــــ!' اور میں یہ سوچ سوچ کر بہت روئی تھی۔ میں سوچتی ہی چلی گئی تھی ـــــ رضیہ کی شادی آخر کیوں ہوگئی ـــــ؟ اور میں یونہی بیٹھی کی بیٹھی کیوں رہ گئی ـــــ؟! ماں باپ کے سر پر ایک بوجھ بن کر ـــــ ہم سایوں کے لیے گفتگو کا ایک موضوع بن کر ـــــ آخر کیوں ـــــ؟ میں رضیہ سے بڑی تھی۔ شادی تو پہلے میری ہونی چاہیے تھی ـــــ آخر اس میں کون سے سرخاب کے پر لگے تھے ـــــ؟!!'

اُس دن میں خوب خوب روئی تھی۔ دیکھنے والوں نے سمجھا ہوگا چھوٹی بہن کی جدائی میں میں نے اِس طرح جان ہلکان کی ہوگی۔ میں اکیلی رہ گئی تھی۔ گھر کا آنگن سونا سونا ہو گیا ہوگا۔ گڑیوں کا کھیل پھیکا پڑ گیا ہوگا، آپس کی نوک جھونک اب کون کرے گا، ہر بات پر مجھے رضیہ کی ضد یاد آتی ہوگی ـــــ لیکن میرے دل میں اٹھتے ہوئے جوالا مکھی کو کسی نے نہ دیکھا۔ میرے اندر جو ایک قیامت برپا تھا اسے کسی نے محسوس نہیں کیا تھا۔

مجھے خوشی ہے کہ رضیہ کی شادی ہوگئی ہے۔ اُس کی مانگ میں تارے جگمگا اٹھے ہیں۔ لبوں کے گلاب کی پنکھڑیاں کھل اٹھی ہیں۔ اس کے بہاروں کے سپنے مہک اٹھے ہیں۔ زندگی کی طویل دشوار گزار راہوں کا ایک خوبصورت ساتھی مل گیا ہے۔ اس کے دامن میں خوبصورت پھول کھلیں اور کلیاں مسکرائیں!

لیکن مجھ میں احساسِ کمتری شدید ہو گیا ہے۔ سب کی نظریں مجھے چبھتی چبھتی محسوس ہونے لگی ہیں۔ محلّہ کی عورتیں جب فرصت کے لمحات میں یکجا ہوتی ہیں تو اُن کی گفتگو کا موضوع اکثر میں ہوا کرتی ہوں ـــــ 'صفیہ کی ماں نے بڑی غلطی کی پہلے صفیہ کو بیاہتی،

یہ کون سا تک ہے کہ بڑی کو بٹھائے رہ گئیں اور رضیہ کی شادی کردی۔' رینو کی ماں بولتیں۔

راحت بوا کہتیں ــــــ 'تم کیا جانوگی، ارے بابا جب لڑکے والوں کے یہاں کی عورتیں لڑکی دیکھنے آئی تھیں نا جب ہی سب عورتوں نے رضیہ کو پسند کیا تھا۔ صفیہ میں کوئی عیب نہیں نکالا لیکن خدا جانے کیوں رضیہ ہی پسند آئی ــــــ؟'

نجمہ بھابی بولتیں ــــــ 'چلو ہٹو ــــــ میں یہ سب صفیہ کی ماں ہی کا قصور کہوں گی۔ لڑکے والوں نے اگر پسند بھی کرلیا تھا تو صفیہ کی ماں کو صاف صاف کہہ دینا چاہیے تھا کہ پہلے بڑی بچی کی شادی کرنی ہے۔'

'ہاں ہاں ـــ وہ تو ٹھیک ہے، لیکن اُس بے چاری نے سوچا ہوگا جہاں دو لڑکیوں کی شادی کا سوال ہے، ایک کا مرحلہ تو طے ہو جائے۔ اب بے چاری وہ اِس دن کو تھوڑے ہی سمجھتی ہوں گی کہ کوئی لڑکے والے اب ادھر کا رخ ہی نہ کریں گے۔' سکینہ چچی کہتیں۔

'دیکھو اُس کی قسمت میں کیا ہے۔ صفیہ کے ہاتھ پیلے ہو جاتے تو بہت ہی اچھا ہوتا۔' زینب خالہ کہتیں۔

'لڑکے والے تو کئی ایک آئے۔ لیکن جیسے ہی انھیں معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹی بہن بیاہ دی گئی ہے، سب بدک جاتے ہیں۔ نہ جانے کیا کیا شک کرتے ہیں سب ــــــ!' کلثوم دادی بول اٹھتیں۔

یہ سب سنتے سنتے میرے کان پک گئے ہیں۔ مجھے اپنی قسمت ہی پھوٹی نظر آنے لگی ہے۔ میری ساری امنگیں، سارے ارمان، سارے ولولے اب سرد پڑنے لگے ہیں۔ میری اُمنگوں کی نازک نازک کلیاں بن کھلے مرجھانے کیوں لگی ہیں؟ یہ کیسی خزاں ہے ـــ! یہ کیسی مایوسیوں کا ہجوم ہے ـــ؟ میرے اندر یہ کیسی ہلچل ہے۔ میرے خوابوں کے جزیرے غم اور مایوسیوں کے سیلاب میں کیوں غرق ہونے لگے ہیں۔ میری قسمت کا سورج گہنانے کیوں لگا ہے، یہ کیسی تاریکی پھیلنے لگی ہے۔ سارا عالم تاریک ہوا چاہتا

ہے۔ مجھے کچھ نظر نہیں آرہا ہے۔ ارے کوئی ہے جو مجھے اس تاریکی سے غار سے نکالے ۔ کسی کی آواز نہیں آتی۔ کوئی نہیں بولتا—— سب کے سب گم صم کیوں ہیں——؟ میرے اللہ! یہ کیا ہو رہا ہے——؟ میں پاگل ہو جاؤں گی—— ہاں پاگل——!!

امی نے میرے دل کی کیفیت بھانپ لی ہے۔ وہ میری بہت دلجوئی کرنے لگی ہیں۔ میرے کھانے پینے کا خوب خیال رکھتی ہیں۔ مجھے تنہا نہیں رہنے دیتی ہیں۔ میں جب کبھی اداس رہتی ہوں انھیں بڑا صدمہ ہوتا ہے۔ مجھے بہلائے رکھنا چاہتی ہیں۔ یہ جھوٹے بہلاوے میں کب تک اپنے دل کو دیتی رہوں گی۔ یہ دانستہ فریب—— امی کبھی شاہدہ کو بلا لاتی ہیں اور کبھی نوشابہ کو تاکہ میں اپنی سہیلیوں میں بہلی رہوں۔ شاہدہ مجھے اداس دیکھ کر خود بھی اداس ہو جاتی ہے۔ اُس نے مجھے بہلائے رکھنے کے بہت جتن کیے ہیں۔ ٹرانسسٹر، کتابیں، کیرم اور نہ جانے کیا کیا بٹور لاتی ہے۔ دل و دماغ میں پریشانیوں کے الجھتے دھاگے سلجھنے لگتے ہیں۔

جس دن شاہدہ مجھے پڑوس کے نئے کرایہ دار انور صاحب کے یہاں لے گئی، اُس دن مجھے بہت سکون ملا۔ اس لیے نہیں کہ مسز انور بہت خلیق، بہت ملنسار اور بے حد بے تکلف ہیں، بلکہ اس لیے کہ اُن کے یہاں کے ماحول میں مجھے بہت ہی اپنا پن محسوس ہوا۔ میز پر دونوں کی ایک ساتھ مسکراتی ہوئی تصویر، ہنگر پر ٹنگے ہوئے انور صاحب کے کوٹ کی گردن میں حائل، مسز انور کا دوپٹہ، اسٹینڈ کے فٹ بورڈ پر انور صاحب کے جوتوں کے درمیان مسز انور کی سینڈل، پلنگ پر رکھے ہوئے دو خوبصورت نقش و نگار والے تکیہ سے اُن دونوں کی گہری محبت کی خوشبو آتی ہے اور انھیں دیکھ کر مجھے نہ جانے کیوں بہت ہی تسکین ملتی ہے۔ اُن کی دو پیاری پیاری پھول جیسی بچیوں نے تو میرا دل ہی موہ لیا ہے۔ دونوں میرے پاس اِس طرح کھیلتی رہتی ہیں جیسے وہ کب کی میری آشنا ہوں اور پھر مسز انور کی باتوں میں وہ پیار، وہ خلوص اور وہ ہمدردی ہے کہ میں اُن کی گرویدہ ہوگئی ہوں اور اپنے سارے غم بھولتی جارہی ہوں۔

میں انھیں باجی کہنے لگی ہوں۔ اب تو یہ عالم ہے کہ اُن سے جدا ہونے کو جی نہیں چاہتا۔ نہ جانے کون سا جادو کر دیا ہے باجی نے۔ انور صاحب کو جس دن میں نے دیکھا تو بس دیکھتی ہی رہ گئی۔ کتنے خوبصورت ہیں وہ! بالکل فلمی ہیرو جیسے! اُن کا مسکراتا مسکراتا سا چہرہ، بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں اور خوبصورت بال مجھے بہت ہی اچھے معلوم ہوئے۔ انھیں دیکھ کر میرے خوابوں کا شہزادہ مجھے یاد آ گیا جس کے خیالی خاکے میرے ذہن میں کب سے محفوظ تھے۔ کتنی غضب کی مشابہت تھی! انھیں دیکھ کر میرے جسم کا رواں رواں جاگ اٹھا ہے۔ دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئی ہیں۔ مجھے بے کلی سے ہونے لگی ہے۔ میرے سوئے ہوئے سارے سپنے مہک اٹھے ہیں۔ میرے ذہن سے اداسیوں کے دبیز کالے بادل چھٹنے لگے ہیں اور خوشیوں کا روشن سورج طلوع ہونے لگا ہے۔ مجھے اپنی خوشیوں کی جنت سجا لینے کی تمنا بیدار ہوتی نظر آنے لگی ہے۔

ایک شام جب ریشمی اجالے سے مخملی اندھیرا گلے مل رہا تھا۔ میں باجی کے پاس بیٹھی باتوں میں مگن تھی کہ اچانک کمرے میں انور چلے آئے۔ میں انھیں دیکھ کر سمٹنے لگی، انھوں نے آتے ہی کہا:

"ہیلو صوفیہ لارین ــــــ!"

میں اُن کے اِس تخاطب سے اندر ہی اندر مچل سی گئی اور صوفیہ لارین کی سنہری زلفیں، کشادہ گورا چٹا سا چہرہ اور متناسب قد میری نگاہوں میں ایک لمحہ کے لیے گھوم گیا اور میں جواب میں صرف مسکرا دی۔ باجی نے انھیں تیکھی نظروں سے دیکھا۔ وہ اُن کی نظروں کا مفہوم سمجھ گئے اور گھبرائے ہوئے سے باہر چلے گئے۔ باجی میری طرف دیکھ کر مسکرائیں اور کہنے لگیں ــــــ "تم مجھے باجی کہتی ہو نا ــــــ یہ بات انھیں آج ہی معلوم ہوئی ہے۔ اس لیے تم سے مذاق کرنے کے موڈ میں تھے۔ تم برا نہ ماننا ــــــ!"

انور صاحب کے اِس ریمارک نے میرے اندر جیسے سیکڑوں تیز بلب روشن کر دیے تھے اور میں سرخ سرخ سے کچھ عجیب تذبذب کے عالم میں بہت دیر تک بیٹھی اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا رہا کہ نہ جانے کس لمحہ

میرے اندر خوشیوں کی چھوٹتی ہوئی پھلجھڑیاں یکا یک باہر ابل پڑیں۔ میرا انگ انگ مسکرا رہا تھا۔ میرے دل میں ایک خلش سی ہونے لگی تھی۔ انور کی ہر ادا مجھے بھانے لگی۔ جس دن انھیں نہ دیکھتی دل عجیب سی بے کلی میں مبتلا رہتا۔ اپنی امی کی نظریں بچا کر میں صبح صبح باجی کے یہاں جا پہنچتی تا کہ انھیں دفتر جانے سے پہلے ایک نظر دیکھ سکوں۔ میرے دل کی ایسی کیفیت پہلے تو کبھی نہ تھی۔ شاید اِسی کیفیت کو پیار کہتے ہیں۔ میں ڈرنے لگی ہوں کہ انور سے مجھے کہیں پیار تو نہیں ہو گیا ——! ہائے اللہ —— اگر پیار ہوا تو میں کیا کروں گی ——؟ میں یہ سوچ کر خود بخود شرمانے لگی ہوں۔ میرے اندر ایک ہلچل سی مچ گئی ہے۔ اگر باجی جان گئیں تو وہ مجھے ہرگز معاف نہ کریں گی۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہ جاؤں گی، لیکن دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔

دوسرے ہی دن مجھے تیز بخار نے آدبوچا اور میں آٹھ دنوں تک بخار کی آگ میں جلتی رہی۔ بخار اترا تو دوسری ہی سہانی شام کو باجی کے یہاں بے تاب جگر اور بے چین نظر لے کر گئی تا کہ دیدار کی راحت سے دل کی دھڑکنوں کو سکون میسر ہو سکے۔ باجی کا گھر سونا سونا سا معلوم ہوا۔ انور اپنے کمرے میں بیٹھے ریڈیو بجا رہے تھے۔ میری آہٹ پر چونکے، مجھے دیکھا تو ایک دم کھل اٹھے۔

''ارے تم —— صوفیہ لارین ——! بھئی آؤ تو سہی ——!!'' کہہ کر مسکراتے ہوئے اٹھے اور بالکل میرے قریب آ گئے۔ میرا دل زوروں سے دھڑکنے لگا۔ میرے کانوں میں ہزاروں سیٹیاں سی بجنے لگیں۔ آنکھوں میں خوابوں کے ہنڈولے زوروں سے ڈولنے لگے —— میں ہوا کے دوش پر اڑنے لگی —— کبھی بلندیوں پر ہوتی اور کبھی یکبارگی زمین پر آ جاتی۔ ایک کھوئے کھوئے جہاں میں دیر تک بھٹکتی رہی —— انور نے مسکراتے ہوئے کہا —— ''تمھاری باجی میکہ گئی ہیں۔ ایک ہفتہ بعد آئیں گی ——''

میں دھڑکتا دل لیے ہوئے واپس آ گئی اور اپنے بستر پر گری دیر تک سوچتی رہی —— ''اُف! آج میں گرتے گرتے سنبھل گئی!!''

■❖■

اے غمِ دل کیا کروں

آج میں سوچتا ہوں کاش میں تم سے کبھی نہ ملا ہوتا——!

آج جدائی کا یہ غم میرے وجود پر تاریکیاں تو نہ بکھیرتا۔ میری رگوں میں نامرادیوں، ناکامیوں کا زہر تو نہ بھرتا۔ یہ وقت جو آج رک سے گیا ہے، یہ ہوا جو تھم سی گئی ہے، یہ فضا جو غم کے آنسو بہا رہی ہے، یہ بہار جس کی گود میں خزاں ہمک رہی ہے اور میری زندگی کی راہوں پر نوکیلے، زہریلے کانٹے بچھا رہی ہے۔ یہ سارا ماحول جو اشکبار سا ہوگیا ہے۔ میری زندگی میں نہ آتا۔ یہ غموں کے دھبے میرے دامن پر نہ پڑتے۔ میرے دل کا آبگینہ تمہارے پیار کی حقیقت کے سنگ ریزوں سے یوں پاش پاش نہ ہوتا۔ یہ دل کا آئینہ یوں نہ ٹوٹ جاتا۔ اس آئینہ پر منقش تمہارا عکس جمیل آج اتنا دھندلا، اتنا گدلا تو نہ ہوتا۔ میرے ارمانوں کا خزانہ یوں پل بھر میں جل کر راکھ تو نہ ہوجاتا۔ میں یوں لٹا لٹا سا، نیم وحشی سا، اپنے وجود کو کھونا تو نہ چاہتا۔ یہ پیار کا محل ریت کے تودوں پر تو نہ بنتا۔ یہ پیار کی تصویریں پانی کی سطح پر کھینچی ہوئی لکیروں کی طرح پل بھر میں زائل نہ ہوجاتیں۔ ہرا بھرا پیار کا چمن یوں دیکھتے دیکھتے نذرِ آتش تو نہ ہوجاتا۔ تیرے پیار کا ایک ایک رسیلا بول جو میرے کانوں میں شہنائیاں بجایا کرتا تھا آج وہی راگ سوگ سے بھرپور تو نہیں ہوتا۔ خلش سے لبریز تو نہیں ہوتا——!!

میں کیا کروں اُن دلنواز لمحوں کو جن کی سانسوں میں تمہاری خوشبو رچی بسی ہے۔ میں کہاں بھاگوں اُن حسین شاموں کے تصور سے جن کی دھڑکنوں میں تمہاری آنکھوں کا

جادو جاگ رہا ہے۔ میں کیسے دامن بچاؤں ان چاندنی راتوں کے سحر سے جن میں تمہارے چاندی سے بدن کا لمس گھلا ہوا ہے۔ میں اپنے دل کی دھڑکنوں سے تیرے نام کی تکرار کیسے مٹادوں۔ میں کیسے بھول جاؤں کہ میں تم سے کبھی ملا تھا!

''ارے یہی تو اروِن ہے۔ کالج کا ہیرو۔ اللہ ——! کتنی ہینڈسم پرسنالٹی ہے!'' تم اپنی کسی سہیلی سے کہہ رہی تھیں۔ میرے قدم رک گئے تھے۔

''آداب عرض ہے ——!'' میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا تھا اور تم سکتے کے عالم میں مجھے دیر تک دیکھتی رہیں۔ میں نے پھر کہا تھا۔

''میں نے کہا ——! آداب عرض ہے ——!!'' تم جیسے خواب سے چونک گئی تھیں اور شرما کر لائبریری کی طرف تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی چلی گئی تھیں۔ میں مسکراتا ہوا کامن روم میں چلا گیا تھا۔

اس پہلی ملاقات نے نہ جانے تم پر کیا اثر کیا کہ دوسرے ہی دن کالج سے واپسی پر تم نے اپنی کار میرے سامنے روک دی اور دوسری طرف کا دروازہ کھول کر اشاروں سے مجھے بیٹھ جانے کو کہا۔ تب میں نے جانا تم بہت بڑے باپ کی بیٹی ہو۔ میں کار میں بیٹھ تو گیا لیکن دیر تک تمہاری دولت اور ثروت سے اپنی ناداری اور بے کسی کا موازنہ کرتا رہا۔ تم نے خاموشی کا طلسم توڑا ——

''چپ کیوں ہیں ——؟ کچھ تو کہیے کہ لوگ کہتے ہیں —— آج غالبؔ...''

میں نے دھڑکتے ہوئے دل کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

''آج غالبؔ کی غزل سرائی ہی تو ہوگی کیوں کہ میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں ساری مستی...''

''اچھا —— اچھا ——!'' تم نے میری بات کاٹتے ہوئے اپنی کار کو کسی موڑ پر بہت تیزی سے موڑا۔ میں ہچکولے کھاتا ہوا تمہاری مرمریں بانہوں سے تقریباً ٹکرا سا گیا۔ ایک پل کے لیے میرے دل و دماغ میں بجلی سی کوند گئی تھی اور تمہاری پلکوں کی اٹھتی

گرتی چلمن سے واقعی ساری مستی شراب کی سی چھلک پڑی تھی۔ میں بے خود ہو گیا تھا۔ سنسان سی سڑک پر تمہاری کار تھم چکی تھی۔ تم نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بے حد جذباتی انداز میں کہا تھا۔

"ارون ــــــ! میں تمہاری ہوں ــــــ!! اور یہ بظاہر ایک سادہ سا جملہ میری تقدیر بن گیا تھا اور میرے منہ سے صرف ــــــ "غزالہ!" نکل سکا تھا۔

تمہارا سارا وجود شاخِ گل کی طرح لچکا اور میری آغوش میں آ کر تھم گیا۔ کیف و سرور کی ایک مسحور کن لہر چلی اور سارے ماحول کو مدہوش کر گئی۔ تمہارے پیار کی مضراب میرے دل کے تاروں پر دھیمے دھیمے پڑتی رہی اور نغمگی کا رس سانسوں کے ہر تار میں پیوست ہوتا رہا۔ میری زندگی مدہوش شرابی کی طرح جھوم جھوم اٹھی۔ تم کیا ملیں مجھے زندگی مل گئی!

میں تمہاری زلفوں کے پیچ وخم میں کھو تو ضرور گیا، لیکن اپنی کم مائیگی کا احساس میرے لیے سوچ کا باعث بنا رہا۔ میں اکثر سوچتا ــــــ میں دھرتی کا باسی آکاش کو کیسے چھو سکوں گا ــــــ؟!!

میرے جیون کی مالا میں صرف غم کے موتی پروئے ہوئے ہیں ــــــ کشمیر کی گلپوش وادیوں میں جنم ضرور لیا، لیکن اپنے دامن میں ہمیشہ کانٹے ہی پائے۔ دکھیاری ماں کے آنسو کبھی خشک نہ ہوئے۔ اُن کے لبوں پر مسکراہٹ کبھی نہ دیکھی۔ جب میں کچھ بڑا ہوا تو ماں نے مجھے وہ سب کچھ بتا دیا جسے جان کر میں بجھ سا گیا۔ میں ابھی دو ہی مہینے کا تھا کہ میرے باپ نے ماں کو طلاق دے دی اور نہ جانے کس جہان میں جا کر اپنا منہ چھپا لیا۔ ماں ایمبا ڈری کے کام کر کے وقت کاٹتی رہی۔ میں ماں کی زندگی میں غموں کا پیغام لے کر آیا۔ میں نے جب کچھ ہوش سنبھالا تو مکتب جانے لگا۔ پڑوسی عبدل چاچا کے مجھ پر کافی احسانات ہیں۔ انھوں نے باپ جیسا پیار دیا۔ جو کچھ حوصلے، ولولے مجھے زندگی میں ملے ہیں سب انھیں کی بدولت ــــــ ورنہ باپ کی ذات سے مجھے سخت نفرت

سی ہوگئی ہے۔ ماں نے ایک تصویر مجھے دکھائی تھی۔ وہ میرے باپ کی تھی۔ میں نے نفرت سے منہ پھیر لیا تھا۔ مجھے وہ تصویر بالکل چنگیز خاں کی معلوم ہوئی تھی۔ ایک جابر، ظالم اور بے درد انسان ـــــ اور آج بھی اس تصویر کو دیکھ کر مجھے وحشت سے ہونے لگتی ہے۔

ایک دن میں نے اپنی زندگی کی کتاب تمہارے سامنے کھول کر رکھ دی تھی۔ تمہاری پلکیں نمناک ہوگئیں۔ میں نے سوچا تھا میں اپنے غموں، اپنی پریشانیوں کے منحوس سائے تم پر نہ پڑنے دوں۔ پھر یہ بھی خیال آیا تھا کہ تمہاری راہوں سے میری راہیں جدا ہیں۔ راستے میں ایک چوراہے پر مل گئے ہیں تو کیا ہوا؟ میں تو ایک انجان سے منزل کا راہی ہوں۔ تمہاری منزل کہیں اور ہے۔ ہم پھر اجنبی بن جاتے تو بہتر تھا۔ لیکن تم نے خفگی میں تنک کر کہا تھا ـــــ

''یہ تم امیری غریبی کا فلسفہ کیا لے بیٹھے۔ میرے پیار کے درمیان دولت کی دیوار نہ کھڑی کرو۔ ہمیں تمہارے پیار کی جنت کے سوا اور کچھ نہ چاہیے!'' اور تم بہت ہی پیاری ادا سے روٹھ گئیں۔ میں دیر تک تمہیں مناتا رہا۔

ایک وہ بھی شام آئی جب تم نے مجھے اپنی ممی اور ڈیڈی سے ملایا۔ میں تمہاری ممی سے مل کر بہت خوش ہوا۔ اُن کی مسکراہٹوں نے میرا استقبال کیا۔ ہر ماں اپنی مسکراہٹوں میں پیار کی لازوال دولت لیے ہوتی ہے اور قدموں میں جنت! اتنی شفیق، اتنی مہربان ہستی دنیا میں اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ تمہاری ماں سے مل کر بے ساختہ مجھے اپنی ماں یاد آ گئی۔ جب میں تمہارے ڈیڈی سے ملا تو مجھے کوئی خوشی نہ ہوئی۔ اُن سے ملتے ہی اپنی ماں کے پاس رکھی اپنے باپ کی تصویر میرے ذہن میں گھوم گئی۔ کتنی مشابہت، کتنی مطابقت تھی دونوں میں! تصویر کا وہ چنگیز خاں مجھے یاد آ گیا اور میں نے بہت بے دلی سے انھیں آداب کیا۔ تم نے دونوں سے میرا تعارف کرایا۔

''یہ ہیں میرے کالج کے ساتھی مسٹر ہارون ـــــ بڑے ذہین اور خوش طبع۔''

ارے یہ کیا——؟ تم نے مجھے اروِن سے ہارون بنادیا—— میں کچھ بول نہ سکا۔ تم نے کس مصلحت سے ایسا کیا، میں سمجھا نہیں۔

''اور ہارون—— یہ ہیں میری ممی اور یہ ہیں ڈیڈی کرنل پرویز خان——''
تم میری طرف مخاطب تھیں۔ میں نے دل میں سوچا یہ پرویز خاں نہیں چنگیز خاں معلوم ہوتے ہیں۔

''آپ بزرگوں سے مل کر بہت مسرت ہوئی——'' میں نے خالص رسمی انداز میں کہا۔ لیکن دل تمہارے ڈیڈی سے مل کر نہ جانے کیوں بوجھل بوجھل سا ہو گیا تھا۔

تم چہک چہک کر بہت ساری چیزیں ناشتہ کے لیے لاتی رہیں۔ ہم سب نے مل کر شام کی چائے ایک ساتھ پی۔ تم بہت خوش تھیں۔ تمھیں اس طرح خوش دیکھ کر میرا دل بھی کھل اٹھا تھا۔ جب میں تمہارے یہاں سے لوٹا تو تمہاری ممی نے بہت شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرے اور بہت ساری دعائیں دیں۔ تمہارے ڈیڈی بیٹھے پائپ سے دھواں اڑاتے رہے۔

''تم نے مجھے اروِن سے ہارون کیوں بنادیا——؟'' میں نے تمہاری چوٹی پیچھے کھینچی۔

''بتاتی ہوں——'' تم نے موٹر کی رفتار سست کر دی اور میری طرف مسکرا کر دیکھا۔ میں نے چوٹی چھوڑ دی۔

''اروِن ہندو کا نام ہے نا——؟'' تم نے اتنا کہا اور موٹر کی رفتار تیز کر دی۔

''تمہاری نام بدلنے سے میں مسلمان تو نہیں ہو گیا——؟''

''نام میں نے اپنے لیے تھوڑا ہی بدلا تھا——؟ وہ تو ڈیڈی کا خوف تھا جو اس معاملہ میں بہت کٹر ہیں!''

''اچھا——! تو تم اپنے ڈیڈی کو بھی بلف دیتی ہو!'' تم ادائے دلبری سے صرف مسکراتی رہیں۔

اُس شام کے بعد میرے دل میں تمہاری اور محبت جاگ اٹھی۔ میں تمھیں روح کی گہرائیوں سے چاہنے لگا۔ عہد و پیان کے رنگین ڈورے بندھے اور میں پیار کے آسمان کی وسعتوں میں گم ہوتا گیا۔ تمہاری آنکھوں کی گہری نیلی پرسکون جھیل میں میں اپنے آپ کو ڈبوئے رہتا۔ تمہاری ریشمیں زلفوں کی گھنگھور گھٹاؤں سے اٹھتی روح پرور سی خوشبو میرے وجود کو معطر کرتی رہتی اور میں بے سدھ تمہارے رخسار کی چاندنی میں نہاتا اُس جبینِ ناز کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہتا، جس سے کرنیں پھوٹ پھوٹ کر میرے دل کی دنیا کو روشن کرتی ہوتیں۔ میری دنیا میں کہیں تاریکی نہ تھی۔ میرا سارا جہان منور ہو گیا تھا۔

اور ایک دن ـــــــ

یہ قطب مینار کی بلندیاں ـــــــ ساری دلّی نظروں کے سامنے ہے! ہم تیسری منزل پر تھے۔ ہوا کا لطیف جھونکا تمہارا دوپٹہ اڑا رہا تھا۔ اس سے اڑتی ہوئی خوشبو میرے دل و دماغ پر چھا رہی تھی ـــــــ میں دلّی کو دیکھ رہا تھا۔ کتنی عظیم، کتنی بلند!

یہ لال قلعہ کا وقار ـــــــ جیسے شہنشاہِ شاہجہاں دربارِ عام میں رونق افروز ہوں ـــــــ یہ عمارت، یہ فن کی لازوال دولت!

'واقعی میرے لال قلعہ کا یہ دربارِ حسن کتنا اچھوتا ہے، کتنا بانکا ہے ـــــــ' میں خود میں مگن تمھیں دیکھ رہا تھا۔

یہ موتی مسجد کا حسن ـــــــ یہ سجدہ گاہیں، یہ مرمریں فرش ـــــــ یہ فصیلیں، یہ حصار ـــــــ کتنی دلآویز زندگی ہے اس حسن میں ـــــــ! یہ موتی سے دانت، یہ مرمریں بانہیں، یہ شگفتہ چہرہ! میری نگاہیں تم پر مرکوز تھیں۔ تم نے میرے دل کی زبان سمجھ لی تھی اور تمہارا چہرہ احساسِ شرم سے اور بھی گلنار ہوتا گیا۔

یہ کناٹ پلیس کی الٹرا ماڈرن فضا ـــــــ دیسی اور بدیسی تہذیبوں کا سنگم! گیھا ہوٹل کا اندرونی ماحول جیسے بالکل اسٹون ایج ـــــــ باہری حسن جیسے بالکل پیرس! تم

میرے ساتھ ساتھ حسن ورعنائی بکھیرتی رہیں۔
راشٹر پتی بھون کی وسیع عمارت —— مغل گارڈن میں پھولوں کی نمائش۔
گلوں کی نہیں گلبدنوں کی نمائش —— میری گلبدن ماشاء اللہ —— چشمِ بدور —— 'میں نے سوچا۔
بین الاقوامی فلمی میلہ —— انگرڈ تھونس کی اداکاری —— وجینتی مالا کا پرفورمنس —— لتا کی مدھر سریلی تان۔
غالب اکیڈمی —— غالبؔ کی صد سالہ برسی کی تقریبات —— یہ گہما گہمی، یہ رونق ——، تم سلامت رہو ہزار برس۔ ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار! میں نے تمہاری طرف دیکھ کر دھیمے سے گنگنایا۔ تم نے زہد شکن انگڑائی لی۔
رام لیلا میدان میں بادشاہ خان کی تقریر —— لوگوں کا اژدہام —— معزز مہمان کا امن وسلامتی کا پیام!
تمہاری قربت میرا اقرار بنتی گئی۔ اپنی سانسوں کے ہر تار میں تمہاری محبت کے موتی پروئے۔ یہ محبت کے موتی اگر ذرا سا بھی کھسکے، میرے جیون کی مالا بکھری! یہ میں نے اکثر اپنی تنہائیوں میں سوچا۔ تمہیں میں نے ہر گام پر اپنا ہم سفر پایا۔ ایک ایک قدم پر تمہاری مسکراہٹوں کے پھول کھلتے رہے۔ میں کتنا خوش نصیب ہوں!
لیکن یہ کیا ——!؟ یہ امیدوں کی قندیلیں کس نے بجھا دیں! سارا عالم مہیب سناٹے اور دبیز اندھیروں میں کیسے ڈوب گیا ہے؟ یہ طوفان کہاں سے آ گیا؟ جس نے میری خوشیوں کے چراغوں کو گل کر دیا؟ یہ بادِ سموم کے مہکتے جھونکے، یہ گرد آلود جھکڑ کہاں سے آ رہے ہیں۔ میری مسرتوں کے چمن کو ریگ زار کس نے بنا دیا؟
یہ سسکتی ہوئی کائنات ——! یہ اجڑا ہوا دیار ——!! یہ لٹا ہوا مسافر!!!
'ماں ——! تم کیا جانو کہ تمہارے خط نے کیا قیامت ڈھائی ہے ——! اس نے میرا سب کچھ بدل دیا ہے ——!!'

ماں کے خط کا ایک ایک لفظ میرے کانوں میں گونج رہا ہے ——

''بیٹا ارون —— اپنا پڑوسی سنتوش آرٹسٹ کل ہی دلّی سے اپنی تصویروں کی نمائش کے بعد واپس آیا ہے۔ اس نے بتایا ہے نمائش میں تمہارے کھوئے ہوئے پتا جی سے ملاقات ہوگئی جو سنتوش کے بچپن کے ساتھی تھے۔ سنتوش نے انھیں فوراً پہچان لیا۔ اس نے آکر مجھے بتایا ہے۔ یہ بات تو بہت خوشی کی ہوئی کہ تمہارے کھوئے ہوئے پتا کا سراغ ملا، لیکن اس الجھن کے ساتھ کہ انھوں نے اپنا مذہب تبدیل کر کے ایک مسلمان دولت مند خاتون سے دلّی ہی میں شادی کرلی ہے اور کرنل پرویز کے نام سے مشہور ہیں —— میں چاہتی ہوں تم قانون کا سہارا لے کر اُن سے اپنا حق مانگو۔

تمہاری ماں'

غزالہ — یہ کیسی مصیبت ہے ——!! میں کس طرح کا حق مانگوں ——؟ کس سے مانگوں —— تم ہی بتاؤنا ——؟! اب ہمیں جینے کا بھی کوئی حق دے سکے گا ——؟

میں اپنے دل کے غم کو، دل کی وحشت کو کیا کروں ——؟

میرے دل کے کینوس پر بنی پیار کی رنگین تصویر پر کس نے کالک پوت دی۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ یہ آنکھیں بے نور ہوتی جارہی ہیں۔ اب یہ جمنا کی چنچل موجیں میرے دل کے اضطراب کو ٹھنڈک بخشتی جارہی ہیں۔ یہی موجیں ہیں جنھوں نے نریش کمار شاد کو اپنی آغوش میں راحت دی تھی۔ میں بھی انھیں کا سہارا ڈھونڈ رہا ہوں۔ یہ دور تک پھیلا ہوا محدود آسمان ہمیشہ بے رحم رہا ہے۔ میری آواز ڈوبتی جارہی ہے۔ غزالہ! مجھے معاف کردینا!

کاش میں تم سے کبھی نہ ملا ہوتا ——!!

■❖■

کب صبح ہوگی؟

لمبی سی چمچماتی پلائی ماؤتھ کلب کے پورٹیکو میں بہت آہستگی سے رکی۔

شوفر نے جب دروازہ کھولا تو خوشبو کا طوفان سا اُمڈا۔

پچھلی نشست سے خوبرو راکیش بڑی شان سے اترا اور اُس کے بعد نازک اندام سی انوراگ ٹیرین کی سبز ساری میں ملبوس سبز پری کی طرح نمودار ہوئی۔ اس نے کار سے اترتے ہی اپنے وینٹی بیگ سے چھوٹا سا آئینہ نکالا اور چہرے کا جائزہ لے کر ہونٹوں پر لپ اسٹک پھیری۔ بالوں کے اونچے سے جوڑے کو درست کیا اور راکیش کے پیچھے چلتی ہوئی کلب کے ہال میں داخل ہوگئی۔ ہال دلہن کی طرح سجا سنورا تھا۔ رنگین بلب قوسِ قزح کے سے رنگ بکھیر رہے تھے۔ بڑے بڑے رنگین غبارے جا بجا لٹک رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے ٹیبلوں کے گرد لگی کرسیوں پر خوبصورت جوڑے اس انداز سے جلوہ گر تھے کہ ہر دیکھنے والے کو شاداب پھولوں کے گلدستہ کا دھوکا ہوتا تھا۔ آرکسٹرا پر ہلکی ہلکی دھن بج رہی تھی۔ سارا ماحول کیف و مستی میں ڈوبا ہوا تھا۔

راکیش اور انوراگ بھی ایک طرف خالی میز پر جا کر بیٹھ گئے۔

آج کلب نائٹ منائی جا رہی تھی۔ ساری رات کا پروگرام تھا۔ کلب کے ممبروں کے لیے یہ کلب نائٹ ماہ میں ایک بار منائی جاتی تھی، جس میں ہر ممبر کو پروگرام کے کسی نہ کسی آئٹم میں حصہ لینا پڑتا تھا۔

پروگرام نو بجے سے شروع ہونے والا تھا۔

ابھی نو بجنے میں آدھ گھنٹہ کی دیر تھی۔
راکیش نے بیٹھتے ہی انوراگ کو چھیڑا —— "تمہاری پلکوں پر یہ اداسیوں کے سائے کیوں تھرک رہے ہیں؟"
"نہیں تو ——!!" انوراگ جیسے خواب سے چونکی۔ اس کے رنگین لبوں پر مسکان بکھر گئی۔
"سنا ہے چہرے کو دل کی کتاب کہتے ہیں ——" راکیش آہستہ آہستہ ترنم ریز تھا۔
"میرا دل اب میرے پاس رہا کہاں ——؟ وہ تو اب تمہارے قبضہ میں ہے ——!" انوراگ نے پہلی بار زبان سے اپنی محبت کا اظہار کیا۔
اور راکیش جیسے جھوم جھوم گیا۔ ٹیبل پر رکھے گلدستہ سے اس نے ایک شاداب سا گلاب توڑا اور انوراگ کے جوڑے میں چوم کر لگا دیا۔ انوراگ آنکھیں موند —— نہ جانے کہاں کھو گئی۔ یہ لمحہ جس کی وہ جنم جنم سے منتظر تھی نہ جانے یکا یک کیسے اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ اسے میسر ہو گیا تھا۔ آج کی یہ کلب نائٹ اپنے ساتھ مسرتوں کا پیغام لے کر اس کے قدموں میں بچھ گئی تھی۔ راکیش اُس کی زلفوں سے دیر تک کھیلتا رہا اور انوراگ اپنے خیالوں میں مگن نہ جانے کہاں کہاں کے خواب دیکھتی رہی۔
یکا یک اناؤنسر کی آواز گونجی —— "لیڈیز اینڈ جنٹلمین —— کلب نائٹ مبارک ——!!"
دونوں چونک گئے۔
ہال میں تالیاں گونج اٹھیں۔
"روایت کے مطابق سب سے پہلے کلب کے نئے ممبروں کا تعارف پیش کرتا ہوں۔ مسٹر کمل باسو، اس شہر میں نووارد ہیں۔ ارونا ساہو کمپنی کے نئے مینجنگ ڈائرکٹر —— بڑے زندہ دل اور پُر لطف شخصیت کے مالک ہیں اور اُن کی مسز اپرنا باسو۔"

مسٹر اور مسز باسو اپنی جگہ سے اٹھ کر ڈائس پر آئے اور مسکرا کر اپنے ہاتھ فضا میں لہرائے۔

تالیوں سے ہال گونج گیا۔

''مسٹر صادق جمال اور مسز سعیدہ جمال ـــــ بھارت کلاتھ ملز کے روحِ رواں ـــــ شاعرِ خوش الحان، بذلہ سنج اور ہمدرد انسان ـــــ''

دونوں نے ڈائس تک پہنچ کر اپنے سلام پیش کیے۔

تالیوں سے ہال گونج گیا۔

''مسٹر راکیش ـــــ شہر کے ایک خوش نصیب ـــــ ڈیلی سن رائز نیوز پیپر اور پریس کے مالک۔ بلند حوصلہ، ترقی پسند اور ہونہار ـــــ''

راکیش نے ڈائس پر کھڑے ہو کر مسکراہٹوں کے درمیان اپنے ہاتھ فضا میں لہرائے۔

تالیاں پھر گونج پڑیں۔

''مس انوراگ اگروال ـــــ اس کلب کے دیرینہ مہربان شری نیروتم اگروال کی اکلوتی لڑکی، ایم اے کی طالبہ ـــــ''

انوراگ سمٹی سمٹی سی اٹھی اور 'نمستے' فضا میں گونجی۔

تالیاں پھر گونج گئیں۔

''تعارف کے بعد میں نئے ممبروں سے گزارش کروں گا کہ وہ کچھ پروگرام پیش کریں۔'' اناؤنسر نے گزارش کی۔

مسٹر کمل باسو نے مائک سنبھالا۔ وہ ایک بنگالی لوک گیت مدھم ترنم سے گا رہے تھے۔

''ساون کی پھوار پھر شروع ہو گئی ہے

میں تمہارا کب تک انتظار کروں ـــــ؟'

اِس تال کا پانی شاہد ہے
اِس کی مچھلیاں گواہ ہیں
میں تمہاری جدائی میں
کتنے آنسو بہاتی ہوں
ساون کی پھوار شروع ہوگئی ہے......"
موسیقی کی ہلکی ہلکی دھن میں جب یہ گیت ختم ہوا تو سارا ہال پھر تالیوں سے گونج اٹھا۔

مسز اپرنا باسو نے اپنی سریلی آواز میں رابندر سنگیت کا جادو جگایا۔
"جب تمہاری آواز سن کر
کوئی نہ آئے
تو تم تنہا چلو......"
ہال میں دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔
اس کے بعد مسٹر جمال صادق غزل سرا ہوئے۔

میں آپ اپنی تلاش میں ہوں میرا کوئی رہنما نہیں ہے
وہ کیا بتائیں گے راہ مجھ کو جنھیں خود اپنا پتہ نہیں ہے

'بہت خوب —— بہت خوب —— مکرر ارشاد ہو قبلہ!' ایسی ہی اور بہت سی آوازیں بلند ہوتی رہیں۔ مشاعرہ کا سا سماں بندھ گیا۔

مسز سعیدہ جمال نے فیض کی ایک غزل سنائی۔
راکیش نے فلمی نغمے سنائے۔
انوراگ نے کلاسیکی موسیقی سنائی۔ تالیوں کی گونج کا تسلسل دیر تک قائم رہا۔
پھر ایک کے بعد دوسرے سبھی ممبروں نے حصہ لیا۔
رنگ اور راگ کی یہ محفل ایک بجے تک گرم رہی۔

پھر جام سے جام ٹکرائے اور فضا پر کیف طاری ہوتا گیا۔

آرکسٹرا پر 'کم سپٹمبر' کی دھن تھرک اٹھی اور سبھی قدم رقصاں ہو گئے۔ جسم سے جسم ٹکراتے رہے۔ دھنوں سے ہم آہنگ قدم اٹھتے رہے، گرتے رہے۔ خم دار کمر میں ہاتھ کی گرفت مچلتی رہی۔ سارے ماحول پر سبز روشنی پھیل گئی۔ انوراگ اور راکیش کی سانسوں کی اکھڑی اکھڑی رفتار تیز ہوتی رہی۔ سبھی جوڑے ایک دوسرے میں کھوئے رہے۔ جسم آہستہ آہستہ تھرکتے رہے۔ رخساروں پر سانسوں کی گرمی پھیلتی رہی اور یہ کیف وسرور کا عالم دیر تک قائم رہا۔ سارا ماحول شرابی ہو گیا۔

کلب نائٹ کی اس مست ومدہوش فضا نے صبح کے پانچ بجے دم توڑا۔

....

انوراگ آنکھیں بند کیے راکیش کے بازو سے لگی رہی۔ پلائی ماؤتھ سنسان سی سڑک پر پھسلتی رہی اور اسی تیز رفتاری سے راکیش کا ذہن ماضی کے کھنڈروں میں بھٹکتا رہا۔

تیز دھوپ میں جھلستا ہوا راکیش شہر کے چوراہے پر سائیکل کھڑی کر کے اخبار فروخت کرتا تھا۔

ٹائمز آف انڈیا ــــــ سٹیٹس مین ــــــ ہندوستان ٹائمز ــــــ اور بہت سے اخبار۔ ایک دن ایک سریلی آواز نے کانوں میں جل ترنگ بجائے۔ 'ایک فیمینا دینا'۔ راکیش اس کی طرف بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ ایک مجسم قیامت اُس کے سامنے کھڑی تھی۔ گندمی رنگت، غلافی آنکھیں، ستواں خوبصورت سی ناک، گلاب کی پنکھڑیوں جیسے ہونٹ، موتی جیسے دانت، خوبصورت بل کھائی ہوئی ریشمی زلفیں۔ انگ انگ سے ٹپکتا شرابی شباب! ایک وقفہ کے لیے راکیش کو مسحور کر گیا۔ وہ Femina کے ساتھ ساتھ اپنا دل بھی فروخت کر چکا تھا۔ اب اس کا یہ معمول ہو گیا تھا کہ صبح دس بجے اس سریلی آواز کا اُسے شدت سے انتظار رہتا۔ جس دن وہ نہ آتی راکیش عجیب سی بے چینی محسوس کرتا۔ اُسے ایسا

محسوس ہوتا جیسے کوئی قیمتی شے کھوگئی ہو۔ راکیش نے اکثر اپنے بے صبر دل کو سمجھایا تھا—— 'وہ جھونپڑی میں رہ کر محلوں کے خواب کیوں دیکھ رہا ہے——؟' لیکن دل کا کچھ اور ہی جواب تھا۔ 'اپنی پسندیدہ چیز کی تمنا کرنا گناہ نہیں۔ ہوسکتا ہے کبھی امیدوں کی جگمگاتی صبح نمودار ہوجائے——' اور واقعی ایک ایسی سہانی سی صبح جگمگائی، جس نے راکیش اخبار فروش کو اخبار کے پریس کا مالک بنادیا۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ اسے قسمت کا کھیل ہی کہا جاسکتا ہے۔ انوراگ جو پہلے راکیش سے کتراتی تھی۔ اب اس کے رگِ جاں سے بھی قریب آگئی تھی۔ یہ دولت کی کشش تھی، دولت کی چمک دمک تھی، جس نے انوراگ کو راکیش کا گرویدہ بنادیا تھا۔ راکیش کے دوستوں کے حلقہ میں یہ بات گشت کرنے لگی تھی کہ انوراگ کے امتحانات کے نتیجہ کے فوراً بعد ہی دونوں شادی کے بندھن میں بندھ جائیں گے۔ نیروتم اگروال جی کو بھی انوراگ کی پسند بہت موزوں معلوم ہوئی اور وہ بھی شادی کے لیے تقریباً رضامند ہوگئے تھے۔

راکیش خیالات کے تانے بانے میں الجھا رہا۔ اس نے سوچا، اس نے اپنی زندگی میں کتنے صبر آزما لیل ونہار گزارے ہیں۔ بیوہ ماں نے محنت مزدوری کرکے اسے بی اے تک تعلیم دلوائی۔ جب ہوش سنبھالا تو اندھیرا ہی اندھیرا چھایا ہوا دیکھا۔ کوئی پرسانِ حال نہ تھا، کسی ہمدرد کا سر پر سایہ نہ تھا۔ سارے اپنوں نے نظریں موڑ لی تھیں۔ دو جوان بہنوں کا بوجھ، سن رسیدہ ماں، جس نے اپنی زندگی میں صرف تاریکیاں ہی دیکھی تھیں۔ اس کی گرتی ہوئی صحت کی فکر، غمِ روزگار کی صعوبتیں، ایک ناتجربہ کار نوجوان کے لیے پریشانیوں اور الجھنوں کا دروازہ وا کرتی تھیں۔ ملازمت کی تلاش میں وہ پورے شہر میں سرگرداں رہا۔ لیکن ہر جگہ مایوسیاں ہی نصیب ہوئیں۔ اس نے بہت صبر واستقلال سے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ لیکن خوش نصیبی میسر نہ آئی۔ صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹتا ہی چلا گیا اور ایک دن ایسا بھی آیا کہ راکیش نے گریجویٹ کے احساس میں بنی شکل اپنے چہرے سے اتار پھینکی اور سڑکوں پر اخبار فروش کا چہرہ چڑھا کر گھومتا نظر آیا۔ اس نے سوچا۔

اس دور میں محنت کا صلہ مل نہیں سکتا
محنت ہی وہ کہتے ہیں کہ محنت کا صلہ ہے

سارے دن کی تگ و دو میں جو کچھ ملتا وہ ماں کے ہاتھ پر رکھ دیتا۔ زندگی کا پہیہ گردش کرنے لگا۔ وہ اپنے آپ میں بالکل مطمئن تھا۔ اس نے اکثر سوچا موجودہ سماج کی تشکیل ہی کچھ اِس انداز سے ہوئی ہے کہ غریب ہمیشہ ہی غریبی و ناداری کی اندھیری رات میں سسکتا، بلکتا رہے گا اور دولت مند ہمیشہ ہی دولت کی روپہلی چاندنی میں نہاتے رہیں گے۔ لیکن جینے کی راہ تو بہر حال ہموار کرنی ہوگی۔ Struggle for existence کو اصولِ زندگی بنانا ہوگا۔ بے کسی اور ناداری کی تاریک رات کبھی تو ختم ہوگی اور امیدوں کی سہانی صبح اپنی تمام تر تازگی، شگفتگی کے ساتھ کبھی تو جگمگائے گی۔

اور وہ ایک سہانی صبح واقعی جگمگا اٹھی، جس نے اُس کی زندگی کو پُر نور کر دیا۔

دولت اس کے قدموں میں آ گری اور ایک حسن ایسا ضوفشاں ہوا کہ ساری تاریکیاں کافور ہو گئیں اور زندگی نکھر گئی بالکل ایک ہیرے کی طرح!

راکیش نے ایک نگاہ انوراگ پر ڈالی جو اس کے کندھے سے لگی محوِ خواب تھی۔ !انوراگ کی یہ ادا اسے بے حد بھا گئی۔ اسے وہ دیر تک دیکھتا رہا اور کچھ عجیب سی گدگدی کا احساس اس کے سارے وجود پر تیرتا رہا۔ کار تیزی سے بڑھتی جا رہی تھی۔

ناگاہ سامنے سے آتے ہوئے ٹرک کے ہیڈ لائٹ کی تیز روشنی نے راکیش کو چونکا دیا۔ کار ٹرک کے بالکل سامنے آ چکی تھی۔ کار بری طرح ٹکرا جاتی، لیکن راکیش نے تیزی سے اسٹیرنگ بائیں جانب گھما دیا۔ کار سڑک سے نیچے اتری اور ایک کھائی کے دہانے پر آ گئی۔ بریک پر پیر کا دباؤ پوری طرح نہ پڑ سکا اور کار کھائی میں جا گری۔

گھبراہٹ میں راکیش کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس نے ماحول کا جائزہ لیا تو وہ نیند میں چارپائی سے نیچے گرا پڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں دبا بہار اسٹیٹ لاٹریز کا ٹکٹ، جو اس نے کل شام ہی خریدا تھا، اس کا منہ چڑا رہا تھا، جس کی پیشانی پر جلی حروف میں لکھا

تھا، فرسٹ پرائز ڈھائی لاکھ روپئے!' راکیش نے گھڑی پر نگاہ ڈالی تو صبح کے دس بج چکے تھے۔ وہ فوراً اٹھا اور ایک پل میں تیار ہو کر باہر نکل پڑا —— اخبار فروخت کرنے ——! اپنے محبوب کا دیدار کرنے ——!! لیکن اس کے لاشعور میں ایک سوال بار بار ابھرتا رہا —— 'یہ غم کی اندھیری رات کب دم توڑے گی اور خوشیوں کی سہانی صبح کب جگمگائے گی —— ؟ آخر وہ صبح کب ہوگی —— ؟!'

■❖■

روپ بہروپ

آج مدتوں بعد مس مارگریٹ کا ایک خط ملا ہے۔ بالکل مختصر سا ——

''میں بھارت ۱۴ اگست کو آرہی ہوں —— مارگریٹ''

خط پاتے ہی مارگریٹ سے پہلی ملاقات کا دن یاد آیا۔ اور دل میں عجیب سی گدگدی بکھر گئی۔ وہ اگست ہی کی ایک بھیگی سی شام تھی۔ بارش ابھی ابھی ہو کر تھمی تھی۔ فضا بہت ہی مشکبار ہو اٹھی تھی۔ میں نے 'پرنس' میں جیسے ہی قدم رکھا آرکسٹرا کی دھنیں فضا میں بکھر گئیں اور پرنس کی رقاصہ مس لیزا نے کیبرے ڈانس شروع کر دیا۔ مس لیزا کی کسمساتی جوانی بل کھاتی رہی۔ اُس کا انگ انگ تھرکتا رہا۔ سبھی کی نگاہیں بڑی محویت سے مس لیزا کے جوان جسم کا لمس محسوس کرتی رہیں۔ میں آہستہ آہستہ بڑھتا رہا۔ ایک ایک قدم پر جیسے نشہ سا چھا چکا تھا۔ میری چال میں جیسے موسیقی سما چکی تھی۔ آرکسٹرا کی دھن ہی پر میرے قدم بھی اٹھتے رہے، گرتے رہے۔ 'پرنس' کا سارا کا سارا ماحول جیسے رقصاں تھا۔ میں بڑھتا گیا، بڑھتا گیا۔ ایک میز کے سامنے پہنچا ہی تھا کہ ایک نازک انداز سی حسینہ نے مجھے اپنے سامنے کی خالی کرسی پر بیٹھنے کی پرخلوص پیش کش کی۔ میں انکار نہ کر سکا۔

موسیقی کی لہریں تیزی سے بہنے لگیں۔ میں نے اپنی میزبان کی طرف ممنون نگاہوں سے دیکھا۔ وہ زیرِ لب مسکرا دی۔

اور جب فلور ڈانس میوزک شروع ہوئی تو وہ میری ہم رقص تھی۔ کسی اجنبی کے

ساتھ یہ میرا پہلا رقص تھا۔ وہ بہت مہارت سے رقص کرتی رہی۔ اس کی سنہری زلفوں، گلابی رخساروں اور انگاروں جیسے دہکتے جسم سے مسحور کن سی خوشبو پھوٹتی رہی اور میرے سارے وجود کو جھنجھوڑتی رہے۔ قدموں کی جنبش سے اس کی آنکھوں میں خمار پیدا ہو رہا تھا۔ اس کی مرمریں بانہیں میری بانہوں کو حدت بخشتی رہیں۔ موسیقی کے جادو نے عجیب سی کیفیت پیدا کر دی۔ دھیرے دھیرے میرے قدم مدھم ہوتے گئے اور ہال کے ایک تاریک سے کونے کی طرف بڑھتے گئے۔ میں تاریکی میں کھڑا دیر تک اس کے جوان جسم کی خوشبو سے مدہوش رہا۔ پھر یکا یک جیسے ہم دونوں کے خواب ٹوٹ گئے۔

وہ مسکرائی اور اپنے ٹیبل پر آ کر بیٹھ گئی۔ میں بھی اس کے روبرو بیٹھ گیا۔ موسیقی تھم چکی تھی اور اب ہال شیشے میں بند لال پری کے رقص پر جھوم اٹھا تھا۔ جام کھنکتے رہے اور ہوا متوالی ہوتی رہی۔

''ریلی یور کنٹری اِز لَو لی ـــــ بیوٹی فل ـــــ مسٹر...... مسٹر......!''

اس پر شرابی کی سی کیفیت طاری ہو چلی تھی۔ وہ میرا نام جاننا چاہتی تھی۔

''اشوک ـــــ'' میں نے اس کی پریشانی دور کی۔

''اوہ ـــــ اشوک ـــــ! اشوک دی گریٹ ـــــ!!'' وہ مسکرا پڑی ـــــ ''اور مجھے کہتے ہیں مارگریٹ ـــــ تمھیں یہ نام کیسا معلوم ہوا ـــــ؟! آئی ـــــ بولو نا ـــــ!!'' وہ بہک رہی تھی۔

''سویٹ ـــــ! ریلی ویری سویٹ ـــــ!!'' میں نے اس کی دلجوئی کی۔

''میرا وطن انگلینڈ ہے۔ میں ساری دنیا کی سیاحی کر رہی ہوں۔ ملکوں ملکوں گھوم رہی ہوں۔ بہت لطف آتا ہے ـــــ پیرس ـــــ روم ـــــ کویت ـــــ بیروت ـــــ واشنگٹن ـــــ ماسکو ـــــ ٹوکیو ـــــ مائی گڈنس!! یہ دنیا کتنی بڑی ہے۔ انڈیا کی ہسٹری مجھے بہت اچھی معلوم ہوئی ہے ـــــ اشوک دی گریٹ ـــــ!''

میں اس کی بہکتی ہوئی آنکھوں کی مستی میں گم تھا۔

دفعتاً وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنی کلائی کی گھڑی کی طرف دیکھ کر مجھ سے مخاطب ہوئی—— ''رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔ مجھے اب نیند بہت ستا رہی ہے۔ میں اسی ہوٹل کے کمرہ نمبر ۲۲۷ میں ٹھہری ہوں۔ تم ابھی کچھ دیر کے لیے رک جاؤ نا—— اشوک ——! پلیز——!!''

میں عجیب کشمکش میں مبتلا تھا۔ مجھے مارگریٹ کی اس دلیری پر بہت حیرت ہو رہی تھی۔ اتنی مختصر سی ملاقات اور اتنی بے تکلفی! میں کترا کر نکل جانا چاہتا تھا۔ میرے دل میں طرح طرح کے خیالات ابھرتے رہے—— 'یہ لڑکی کہیں غیر ملکی جاسوس نہ ہو، دشمنوں کی کسی تنظیم سے تعلق نہ رکھتی ہو، کوئی کرسٹن کیلر ثانی نہ ہو——' لیکن مجھ سے اسے ملے گا بھی کیا——؟ میں اسے سہارا دیتا ہوا سیڑھیاں طے کرنے لگا۔ اس نے کمرہ میں پہنچ کر مجھے ایزی چیئر پیش کی اور کمرہ کی عقبی کھڑکی کھول دی۔ باہر ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ بادلوں کے بیچ چاند شرما رہا تھا۔ سمندر کی لہروں پر جب چاندی پڑتی تو ایسا معلوم ہوتا نور کا دریا بہہ رہا ہے۔ کھجوروں کے لمبے لمبے سائے ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے۔ ایک عجیب پُر کیف منظر تھا۔ میں ان نظاروں میں گم تھا کہ مارگریٹ شب خوابی کے لباس میں میرے پیچھے آ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ بھی ان نظاروں میں گم تھی کہ میں نے اسے ٹوکا۔

''ہاؤ ڈو یو لائک دس؟''

''اوہ—— اِٹ اِز ونڈر فل گڈ—— بیوٹی فل—— یہ تو ورڈز ورتھ کی شاعری ہے—— بالکل شاعری—— عمر خیام کی رباعیوں نے ایسے ہی موسم میں جنم لیا ہے۔ ان رباعیوں سے تو مجھے عشق ہے—— عشق——!!'' وہ مچل پڑی تھی۔

''تم بھی تو قدرت کی ایک خوبصورت غزل ہو——! کتنی حسین شاعری کی گئی ہے۔ میں بھی کہیں تم سے پیار نہ کر بیٹھوں۔'' میں اپنے جذبات نہ روک سکا اور حقیقت کہہ گیا۔

''پیار ——! ہاہاہا ——!! —— ہاہاہا ——!!!'' وہ بے تحاشہ ہنستی جارہی تھی۔ جیسے میں نے کوئی نہایت ہی بھونڈی بات کہہ دی ہو۔ ''عشق و محبت کے معاملہ میں میرا نظریہ بہت رجعت پسندانہ ہے۔ میں ہوس کو محبت کا نام دینا محبت کی توہین سمجھتی ہوں۔ محبت تو ایک فطری جذبہ ہے جس کا اظہار اُسے بالکل سطحی بنا دیتا ہے۔ میں تو خاموش محبت کی قائل ہوں۔ میرے سامنے محبت کا اظہار اس پاک جذبے کی توہین ہے۔'' وہ بے حد جذباتی انداز میں کہے جارہی تھی۔

''میں تمہارے خیالات سے متفق ہوں۔ لیکن میرا بھی تو کوئی نظریہ ہوسکتا ہے۔ میرے خیال میں تشنہ لبی بغیر لب کشائی کے جان لیوا بھی تو ثابت ہوسکتی ہے اور وہ پیاس ہی کیا جو تسکین تک نہ پہنچے۔ میں تو ہنستی کھیلتی، رنگا رنگ اور بھرپور زندگی کا شیدائی ہوں —— غموں سے دور —— پیار و محبت کی حسین وادیوں میں ہمکتی سی زندگی!!''

میں نے اپنے خیالات اس پر روشن کرڈالے۔

وہ زیرِ لب مسکرائی اور ایک توبہ شکن سی انگڑائی لی اور میرے شانے سے آ لگی اور بولی —— ''اشوک ! اس بحث کو طویل نہ کرو۔ بھلا یہ موسم یوں ہی برباد کرنے کا ہے —— ؟!''

میں اس کی بے باکی سے بہت ہی متاثر ہوا۔ ایک اجنبی سے پہلی ہی ملاقات میں اس طرح کھل کر باتیں کرنا مجھے عجیب معلوم ہوا۔ میں اس کی زلفوں کے پیچ وخم میں الجھتا رہا۔ اس کے رخسار کی لالی سے شفق چراتا رہا —— اور جب رات کا آنچل سرکا اور صبح کی مسکراہٹ بکھری تو میں مارگریٹ کے بہت قریب آ گیا تھا جیسے اُس کا میرا ساتھ جنم جنم کا ہو۔

میں شام کو پھر ملنے کا وعدہ کر کے چلا آیا۔ لیکن سارا دن عجیب سی کیفیت مجھ پر طاری رہی۔ کتنی شاموں کی مہکتی روشن سی مانگ کو ہم دونوں نے اپنے پیار کے صندلی سندور سے سجایا۔ گیٹ وے آف انڈیا، جوہو بیچ، چوپاٹی، میرین ڈرائیو، سن اینڈ سینڈ کے

سوئمنگ پول، مراٹھا مندر، ہر جگہ میں مارگریٹ کے ساتھ ساتھ رہا۔ پھر وہ تنہا شہروں شہروں گھومتی رہی۔

کشمیر کی گل پوش وادیوں میں اسے سوئٹزرلینڈ کی پرچھائیاں نظر آئیں۔ الورا اور اجنتا کی گپھاؤں میں ہندوستان کی عظمت کی تاریخ کے اوراق اس کے ذہن میں ابھر آئے۔ لکھنؤ اور حیدرآباد میں تہذیب واخلاق کی جنت نظر آئی۔ پنجاب کے ہرے بھرے کھیتوں میں ہندوستان مسکرایا اور ہواؤں میں کیف وسرور کی نغمگی ملی۔ صبح بنارس میں دین اور دھرم کا سورج جگمگایا اور فضاؤں میں عقیدت مندوں کے دلوں کی دھڑکنیں تحلیل ملیں۔ کلکتہ کی فضاؤں میں زلفوں کا جادو سرسرایا اور الٹرا ماڈرن زندگی کی تصویر ملی۔ وہ سارا ہندوستان دیکھتی رہی۔ میں اس کے خطوں کا روز انتظار کرتا رہا۔

اُس نے کلکتہ سے ایک خط لکھا ——

''ڈیر اشوک —— میں بمبئی واپس آنا چاہتی ہوں۔ لیکن چند مجبوریوں کی بنا پر دم دم ہی سے لندن کے لیے پرواز کر رہی ہوں، تم سے نہ ملنے کا افسوس ساری زندگی رہے گا —— !تمہاری مارگریٹ''

میں اس کا خط پڑھ کر جیسے تڑپ گیا۔ ایک بے قراری سی سارے وجود پر طاری ہوگئی۔ اس کا ملنا اور پھر یکایک اس طرح بچھڑ جانا ایک خواب جیسا معلوم ہوا۔ میں بجھا بجھا سا یادوں کی تیز چھری پر اپنے احساسات کی انگلیوں کو مدتوں گھائل کرتا رہا۔ وقت کے مرہم نے دھیرے دھیرے اُن زخموں کو مندمل کر دیا۔

اور اب مدتوں بعد مارگریٹ نے اپنے آنے کی خبر دی تھی۔

ظاہر ہے یہ خبر میرے لیے بہاروں کا پیغام لائی تھی۔ دل میں مسرتوں کا آبشار سا ابل پڑا۔

شانتا کروز کے ایروڈرم پر بہت رونق تھی۔ میں نے اپنی کار پارک کی اور بی او اے سی کے طیارے کا انتظار کرنے لگا۔ ابھی طیارے کے آنے میں تقریباً آدھے گھنٹے کی

دیر تھی۔ یہ آدھا گھنٹہ انتظار کی چبھن میں اور بھی اضافہ کرتا رہا۔ بہت ہی بے صبری میں وقت گزرا۔ طیارے کے آنے کا جب اعلان ہو گیا تو میں پھولوں کا گلدستہ لیے ریلنگ کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ فضا میں سبک سی گڑگڑاہٹ ہوئی اور طیارہ بڑی شان سے لینڈنگ گراؤنڈ پر پھسلنے لگا۔ لیڈر کے لگتے ہی مسافر باہر ابل پڑے۔ میں بینا کولر سے سبھی اترنے والوں کو بغور دیکھتا رہا۔ لیکن مارگریٹ نظر نہ آئی۔ میری پریشانی بڑھتی گئی۔ میں تقریباً مایوس ہو چکا تھا کہ سب سے آخر میں مارگریٹ نمودار ہوئی۔ اس کی گود میں تولیہ میں لپٹا ہوا ایک بچہ تھا۔ اس نے باہر نکلتے ہی بچے کو اپنے لبوں تک لے جا کر بہت بے دلی سے اس کی طرف دیکھ کر فضا میں ہاتھ لہرائے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی کھل کھلا کر ہنس پڑی جو اُس کی خاص عادت تھی۔ وہ باہر چلی آنا چاہتی تھی کہ کسٹم والوں نے اس کے سامان کی چیکنگ شروع کر دی۔ میں باہر کھڑا کھڑا بہت ہی بور ہو رہا تھا۔ ادھر مارگریٹ بھی جلد مجھ سے ملنا چاہتی تھی۔

میں باہر کھڑا سگریٹ پر سگریٹ پیتا رہا۔ مارگریٹ نے اپنا تمام سامان کسٹم والوں کے حوالے کر دیا تا کہ اس کی اچھی طرح جانچ ہو جائے اور تولیہ میں لپٹے اپنے بچے کو سامنے والی میز پر رکھ دیا۔ بچہ بہت اطمینان سے سویا رہا۔ میرے ذہن میں بار بار ایک سوال ابھرتا رہا کہ مارگریٹ نے شادی کب کی؟ اور مجھے بہت مایوسی ہوتی رہی۔ اس کی شخصیت بے حد پُراسرار ہو گئی تھی۔ مجھے خوف ہونے لگا تھا کہ کہیں میں آگ سے تو نہیں کھیل رہا ہوں!؟

جب میں نے کسٹم آفس کی طرف دیکھا تو مارگریٹ کے سامان کی O.K. کر دی گئی تھی اور مارگریٹ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا پورے دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ اس نے میز سے بچہ کو پھر گود میں لے لیا اور دو ہی قدم بڑھی تھی کہ ایک کسٹم آفیسر بہت تیزی سے اس کی طرف لپکا اور قریب پہنچتے ہی بچے کے گال پر ایک طمانچہ رسید کیا۔ کسٹم آفیسر کو اتنی دیر تک بچے کے بالکل جامد و ساکت رہنے پر شک

ہوگیا تھا۔ مارگریٹ کی ایک چیخ فضا میں بلند ہوئی اور بچہ ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر آگرا۔ بچہ مرا ہوا تھا۔ کسٹم فورس نے مارگریٹ کو گھیر لیا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ میں دور ریلنگ پار ہی سے یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ مارگریٹ بار بار میری طرف امداد طلب نظروں سے دیکھتی رہی۔ ضرور کوئی سنگین بات ہوگئی تھی۔ میں پریشان ہورہا تھا۔

کسٹم آفیسر نے بچہ کو ضبط کرلیا تھا۔ اس کا ڈاکٹری معائنہ ہوا۔ رپورٹ سے ظاہر ہوا کہ بچے کے پیٹ کو چیر کر اس میں تیس پونڈ سونا پوشیدہ کر کے کیمیائی مرکب دے کر پھر اسے سی دیا گیا تھا۔

مارگریٹ کو اسمگلنگ کے جرم میں گرفتار کرلیا گیا۔ مارگریٹ نے اپنے بیان میں بتایا کہ وہ لندن کے ایک اسپتال میں نرس ہے۔ وہ اپنی بے باک، شوخ اور چنچل اداؤں سے لندن کی چند بڑی شخصیتوں کی محبوبِ نظر ہے جو اسے اس پیشہ کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ وہ دنیا کے تمام ملکوں میں یہی دھندہ کرتی ہے اور ہر جگہ بچہ ہی کی مدد سے کامیاب ہوجاتی ہے۔ یہ بچے اسے لندن کے اُس اسپتال سے جہاں وہ ملازم ہے بہت اچھی تعداد میں آسانی سے دستیاب ہوجاتے ہیں جن کی مائیں کنواری ہوا کرتی ہیں۔

مارگریٹ کا بے حد نفرت انگیز روپ میرے سامنے تھا۔ یہ روپ تھا دنیا کے ایک نہایت ہی مہذب اور ترقی یافتہ ملک کا —— جس کی سلطنت کی حدود میں سورج کبھی غروب نہ ہوتا تھا۔ جہاں شخصی آزادی اور حقیقت پسندی کے جھوٹے اور بے مقصد جنون میں ہر شوہر اپنے دوستوں کی بیویوں کو بھی اپنی بیوی جیسی سمجھتا ہے اور ہر بیوی اپنے شوہر کے دوستوں کو اپنے شوہر جیسا پیار دیتی ہے۔ کوئی شوہر بیوی پر بھروسہ نہیں کرتا اور کوئی بیوی شوہر پر اعتماد نہیں کرتی۔ جہاں کنواری لڑکیاں گھر کے دروازے پر کھڑی ہوکر اپنے کسی بوائے فرینڈ کے ساتھ شوہر کی طرح باتیں کرتی ہیں اور اُن کے والدین خوش ہوتے ہیں۔ جہاں شیکسپئر، سمرسٹ ماہم اور برٹرنڈ رسل جیسے دانشوروں نے جنم لیا تھا اور

ساری دنیا کو ایک نئی دنیا کے خیالات کی نئی روشنی عطا کی تھی۔ وہی روشنی اب شاید اتنی تیز ہوگئی تھی کہ اس پر اندھیرے کا گمان ہونے لگا تھا اور اسی اندھیرے میں کرسٹن کیلر نے آنکھیں مٹکا مٹکا کر میکمیلن اور اُن کے ہم جنسوں کے چہروں سے مہذب بنے رہنے کا نقلی چہرہ نوچ پھینکا تھا اور دنیا نے اس روپ بہروپ کا ڈرامہ بہت دلچسپی سے دیکھا تھا۔ مارگریٹ پر کیا منحصر یہاں تو الزابتھ ٹیلر، ڈورس ڈے، ہر یجٹ ہارڈو اور میریلن منرو روز ہی جنم لے رہی ہیں اور ترقیوں کے نئے باب وا کر رہی ہیں۔

آج کی مارگریٹ اور ایک سال پہلے کی مارگریٹ میں کتنا فرق تھا! میرے دل میں اُس کے لیے بے حد نفرت پیدا ہوگئی تھی۔ ہندوستان کو سونے کی چڑیا سمجھنے والے اب تک اس پر ڈاکہ زنی کر رہے ہیں۔

میں سوچتا رہا —— 'آج چودہ اگست ہے اور کل یومِ آزادی کا روشن سورج طلوع ہوگا۔ آج اس ملک وقوم کے سب سے بڑے 'مہربان' کو اسیری ملنی ہی چاہیے!'

اور پھولوں کا گلدستہ کسٹم آفیسر کی نذر کر چکا تھا!!

■❖■

گھر ہونے تک

جب مجھے ہوش آیا تو میں ملٹری ہاسپٹل میں پڑا تھا۔
میں نے ماحول کا جائزہ لیا۔ سارے بستر زخمی جوانوں سے بھرے تھے۔ کوئی بیہوش تھا، کسی کے بازو میں گولی لگی تھی تو کسی کی پنڈلی زخمی تھی۔ سبھی جوانوں کے چہروں پر ابھی تک بلند حوصلے اور فتح کے یقین کے گہرے نشانات برقرار تھے۔ اُن کے چہروں پر عجیب سی چمک تھی، چند جوان ایسے بھی تھے، جو زخمی تھے پھر بھی محاذِ جنگ پر جانے کے لیے مچل رہے تھے۔ وہ بار بار ڈاکٹر سے کہتے—— ''جنرل—— پلیز مجھے جانے دو۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ میں بالکل درست ہوں۔''
ڈاکٹر بہت تیکھی نظروں سے اُن جوانوں کو دیکھتا اور زیرِ لب مسکرا کر کہتا—— ''ویل—— تمھیں جنگ پر جانے کے قابل ہی تو بنا رہا ہوں۔ بس دو دنوں کی تو بات ہے—— '' اور وہ آگے بڑھ جاتا۔ ڈاکٹر کی اس بات پر اُن جوانوں کے چہرے بجھ جاتے اور سبھی اپنے اپنے بستر پر گر کر بہت دیر تک گہری محویت کے عالم میں خلاء میں گھورتے رہتے۔
مجھے ایسے جوانوں کے حوصلے دیکھ کر بہت طاقت ملتی اور میں بھی جلد از جلد جانا چاہنے لگتا۔ مگر میرے ڈاکٹر نے مجھے ایسا سوچنے سے بھی منع کر دیا۔ میری حالت دوسرے جوانوں سے مختلف بتائی گئی تھی۔ میرے دونوں پاؤں بری طرح زخمی تھے اور میں آسانی سے چلنے پھرنے کے بھی قابل نہ تھا۔ بائیں پیر میں زہر کے اثرات نمودار ہو گئے تھے اور

آہستہ آہستہ جسم کے دوسرے حصوں میں بھی سرایت کرنے لگے تھے، اسی لیے اُسے کاٹ دینے کے سوا اور کوئی دوسرا چارہ نہ تھا۔ میری رگوں میں خون چڑھایا گیا۔ قوت کے لیے طرح طرح کی دوائیں دی جارہی تھیں۔ پیر کاٹ دیے جانے کی خبر پا کر میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو رواں ہو گئے اور کالج کا وہ سہانا دن میرے ذہن میں یکا یک گھوم سا گیا تھا، جس دن ہاکی کے فائنل میچ میں میں نے تنہا چھ اسکور کیے تھے اور اسٹیڈیم میں بیٹھے سبھی تماشائیوں کی نگاہیں مجھ پر مرکوز ہو کر رہ گئی تھیں۔ میں نے موسم کا سب سے اعلیٰ پرفورمنس دیا تھا اور Best Player کی ٹرافی بھی حاصل کی تھی۔ میں اب شاید کبھی ہاکی نہ کھیل سکوں! یہ میری زندگی کی سب سے بڑی شکست ہوگی! اب میں جی کر کیا کروں گا؟ ایک اپاہج انسان! میرے ذہن میں غموں کا ایک مہیب طوفان آ گیا تھا اور آنکھیں اشکبار ہو گئیں جو دلی محسوسات کی ترجمانی کر رہی تھیں۔

تقسیمِ انعامات کی تقریبات کے بعد جیسے ہی اسٹیڈیم کے باہر نکلا۔ ایک سایہ میری طرف سرکا اور میرے بالکل قریب آتا چلا گیا۔ میں اسے پہچان گیا۔ وہ سنیتا تھی۔ کالج کی مشہور ذہین طالبہ! اس نے میرے قریب آتے ہی بہت تپاک سے مجھے مبارکباد دی اور چہک کر بولی —— ''اویناش —— بھئی واہ! آپ نے تو بس آج کمال ہی کر دیا ہے۔ بہت خوب ——!!''

میں نے بہت انکساری سے جواب دیا تھا —— 'یہ تو آپ کی ذرہ نوازی ہے ورنہ بندہ کس قابل ہے ——'

سنیتا کے خوبصورت چہرے پر اس کی دلی مسرتوں کے نقوش نمایاں تھے، جس سے وہ اور بھی خوبصورت ہو گئی تھی۔ میں نے پہلی بار اس کے حسن کی گرمی محسوس کی تھی۔ اس کے حسن میں غضب کی جاذبیت تھی۔ میں نے محسوس کیا وہ اور کچھ کہنا چاہتی تھی۔ میں نے بات بڑھاتے ہوئے کہا تھا —— ''میں تو سمجھتا تھا آپ کتابوں ہی کی دنیا میں کھوئی رہتی ہیں، لیکن آپ کو اسپورٹس سے بھی دلچسپی ہے۔''

''دیکھئے اویناش صاحب ـــــ کالج میں لوگوں کو میرے متعلق کچھ غلط فہمیاں ضرور ہوگئی ہیں۔ کوئی مجھے مغرور کہتا ہے، کوئی خشک، کوئی سنکی ـــــ لیکن اصل بات یہ ہے کہ میرے ہر معاملہ کے لیے اپنے کچھ اصول ہیں۔ میں اعتدال پسند کرتی ہوں اور خواہ مخواہ (Activities) ایکٹیوٹیز کی قائل نہیں ہوں۔ پڑھتی ہوں تو سنجیدگی سے، سہیلیوں سے فرصت کے لمحات میں ملتی ہوں تو سنجیدگی سے۔ کسی کو بے جالفٹ نہیں دیتی۔ ایسا کرنے سے مجھے ذہنی سکون میسر ہوتا ہے۔ جو کسی مقصد کے حصول کے لیے بے حد ضروری ہے۔ ورنہ سچ پوچھئے تو پڑھنے کے علاوہ مجھے ہر اچھی چیز سے محبت ہے۔''

''یہ باتیں بھی آپ شاید سنجیدگی ہی سے کر رہی ہیں ـــــ؟!'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''جی ہاں ـــــ بالکل سنجیدگی سے ـــــ!!'' وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی تھی اور فضا میں جیسے جلترنگ بج اٹھے تھے۔ اس کے ساتھ جیسے ساری کائنات مسکرا اٹھی تھی۔

''آیئے اسی بات پر چائے ہو جائے ـــــ!'' میں کیفے می لارڈ کی طرف بڑھ گیا۔

کیفے می لارڈ پورے شباب پر تھا۔ اندرونی ماحول بے حد رومانی تھا۔ کیفے کیا تھا حسن و رعنائی کی ایک دنیا تھا! ہر میز پر خوبصورت جوڑے بہت بے تکلفی سے گفتگو میں محو تھے۔ دنیا و مافیہا سے بالکل بے نیاز سے۔ سب اپنے اپنے میں مگن تھے۔ ہم نے بھی کیفے کے ایک گوشے میں جگہ پالی اور چائے کی چسکیوں کے درمیان خوش گپیوں میں مشغول ہو گئے۔ سنیتا مسکرا مسکرا کر پھول کھلاتی رہی۔ اس کے مزاج کی شگفتگی کا احساس آج مجھے پہلی بار ہوا تھا۔ اُس کے سینے میں خلوص و محبت سے معمور دل دھڑکتا تھا۔ اس کی باتوں میں بلا کا عزم، بے پناہ مستقل مزاجی اور بلند حوصلگی تھی۔ میں سنیتا کی بلند شخصیت سے کافی متاثر ہوا تھا، جب ہم کیفے سے باہر نکلے سنیتا میرے دل کے نہاں خانوں میں داخل ہو چکی تھی۔

یہ ایک چھوٹی سی ملاقات پیار بن چکی تھی۔ ملاقاتیں بڑھتی گئیں۔ سنیما، پارک

اور کلب کی مسحور کن فضاؤں میں بھی سنیتا کی سانسوں کی خوشبو مجھے مدہوش کرتی رہی۔
کھیل کے میدانوں میں بھی مجھے اب بہت حوصلہ ملنے لگا تھا۔ میرے کھیل کے مظاہرہ پر جب سنیتا کی خوبصورت نگاہیں میرا تعاقب کرتی رہتیں تو میرے پیروں میں جیسے بجلی کی سی سرعت سمو جاتی۔ وہی میرے کھیل کا نقطۂ عروج ہوتا۔ میرے کھیل میں انوکھی جدت پیدا ہوگئی تھی اور یہ سب سنیتا کی حسین نظروں ہی کا کرشمہ تھا۔ میں لگاتار ہاکی چمپئن ہوتا رہا۔
سنیتا کے پیار نے مجھے نئی زندگی بخش دی تھی۔ خوابوں کی رہگذر پر مہکتی زلفوں کے سائے تھرکنے لگے تھے۔ اس کی مسکراہٹوں کے پھول کھل اٹھے تھے اور دھڑکنوں کی مدھر راگنی بکھری سی گئی تھی۔ میرے سونے سونے لیل ونہار کے پھیکے پھیکے لمحات مہک اٹھے تھے۔ میں تنہائیوں میں گنگنانے لگا تھا۔

زندگی ہی مری افسانۂ رنگیں بن جائے
تم سا عنواں جو کوئی میری نظر سے گزرے

وہ دن میرے کالج کا آخری دن تھا۔ امتحانات ختم ہوچکے تھے اور سبھی طلباء طالبات رخصت ہورہے تھے۔ الوداعی کلاس کو مخاطب کرتے ہوئے پروفیسر دیال نے گلوگیر آواز میں کہا تھا —— ''میرے نوجوان طلبا و طالبات —— کالج کے آزاد ماحول سے آزاد ہوتے ہوئے تمھیں دیکھ کر مجھے دلی تکلیف ہورہی ہے۔ ہر سال یہ دن آتا ہے جس دن ہم کتنے ہی شگفتہ و بشاش چہروں کو زندگی کی کڑی دھوپ میں کمہلانے کے لیے آزاد کرتے ہیں۔ تم نے اپنی آئندہ زندگیوں کے کیا کیا خواب بنے ہوں گے، خدا کرے تمہارے خواب پورے ہوں اور زندگی تمھیں مسکرا کر گلے لگائے۔ تمہاری ہر تمنا پوری ہو۔ زندگی کے نرم و گرم لمحات کی مانگ میں تم اپنے بلند حوصلوں، اعلیٰ کردار اور مستحکم خودداری کی افشاں بھرنا، کالج میں بیتے دنوں کے کسی پل میں اگر کوئی ناخوشگوار حالات پیدا ہوئے ہوں تو انھیں نظر انداز کردینا۔'' پروفیسر دیال کی آواز بھاری ہوچلی تھی اور وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکے۔ سبھی چہرے افسردہ اور بوجھل تھے۔ ایک عجیب سماں تھا۔ سب کی

نگاہیں نیچی اور نمناک تھیں۔

کلاس میں سنیتا کا کہیں پتہ نہ تھا۔ جب میں کلاس سے باہر نکلا تو میری نگاہیں اسی کی متلاشی تھیں۔ میں اسے لائبریری، کامن روم، کینٹین، ہر جگہ تلاش کرتا پھرا، لیکن وہ کہیں بھی نظر نہ آئی، جب کالج گارڈن میں داخل ہوا تو وہ فوارے کے قریب نظر آئی، بالکل تنہا اور بجھی ہوئی سی ——— مجھے دیکھ کر اس نے پہلو بدلے۔ جب میں قریب پہنچا تو اس کی آنکھیں نمناک تھیں۔ میں اس کے پاس بیٹھ گیا اور بولا ——— ''امتحان ختم کہاں ہوا، اب تو شروع ہوا ہے ———!''

وہ اسی طرح خاموش رہی۔

''پتہ نہیں کون کامیاب ہوا؟'' میں خلاء میں جھانک رہا تھا۔

''اوِیناش ——— میں انھیں الجھنوں میں کئی دنوں سے پریشان ہوں۔ مجھے خود پر تو پورا اعتماد ہے مگر تمہارے متعلق کسی خاص نتیجہ پر نہیں پہنچ سکی ہوں اور یہی میری سب سے بڑی پریشانی ہے ———!'' وہ بہت سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔

''میرے متعلق تمہاری کوئی سطحی رائے بالکل نہ ہونی چاہیے۔ میں نے تمھیں اپنی زندگی کا ہم سفر بنانے کا فیصلہ کرلیا ہے اور تمھیں یہ جان کر مسرت ہونی چاہیے کہ میرے ڈیڈی اور ممی بھی تمھیں اس روپ میں قبول کرنے کو رضا مند ہو گئے ہیں۔ میری طرف سے سارے مرحلے ختم سمجھو۔ بس اب جو دیر ہوگی وہ صرف تمہارے فیصلے میں ——— اور تمہاری پریشانی میرا خیال ہے محض بے بنیاد ہے۔'' میں نے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ ڈالا۔

''سچ اوِیناش ——— ؟ تم کتنے اچھے ہو ———!!'' حیرت اور خوشی کے ملے جلے نقوش اس کے چہرے پر ابھرے اور وہ میرے سینے سے آ لگی۔

وقت بہتا رہا ———

امتحانات کے نتیجے نکلے۔ سنیتا امتیازی نمبروں سے کامیاب ہوئی اور طلائی تمغے

حاصل کیے۔ میں نے سیکنڈ ڈویژن پاس کیا۔ میری خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ سنیتا کی عظیم کامیابی میرے لیے خوشیوں کا خزانہ لائی تھی۔ میرے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ میں خوشی سے پاگل ہو رہا تھا۔ اس کامیابی کے موقع پر سنیتا کے ڈیڈی نے ایک خوبصورت سی پارٹی دی، جس میں فوج کے تمام اعلیٰ افسران، شہر کے رؤساء، شرفاء، مقامی حکام اور کالج کے اساتذہ کو مدعو کیا گیا۔ میرے ممی اور ڈیڈی خصوصی طور پر مدعو تھے۔

جس وقت میں سنیتا کے یہاں پہنچا، سارا ہال مہمانوں سے بھرا تھا۔ سارا ماحول خوشگوار و خوش رنگ تھا۔ قہقہوں کی گونج، مسکراہٹوں کی بجلیاں، رنگین آنچلوں کی سرسراہٹ ایک عجیب الف لیلوی منظر پیش کر رہی تھیں۔ سنیتا کے ڈیڈی کرنل رنجیت کے بے حد اصرار پر اُن کے ایک قریبی دوست کرنل زبیری نے پیانو پر ضربیں لگائیں اور فضا میں ایک رنگین غزل کے اشعار جاگ اٹھے۔ سنیتا کی سہیلی اُوشا نے ایک رقص ایسا پیش کیا کہ پنڈت اودے شنکر کی یاد تازہ کر دی۔ دیر تک ہال میں تالیاں گونجتی رہی۔ ہر شخص اوشا کے فن کا مداح تھا۔ پروفیسر گھوش نے ستار پر راگ شیام کلّیان بجائے۔ فضا پر سنگیت کا جادو چھا گیا۔ اس رنگ و نور کی محفل کے آخری لمحات میں کرنل رنجیت نے سنیتا اور میری انگیجمنٹ کا اعلان بڑے فخریہ انداز میں کیا۔ سبھی لوگوں نے مبارکبادیاں دیں اور اپنی دلی خوشیوں کا اظہار بے حد پر مسرت انداز میں کیا۔ اس رات کی رنگین فضا اور بھی رنگین ہو گئی تھی۔ دو دلوں کی خاموش داستان نے زبان پالی تھی۔ اُس رات میں کتنا خوش تھا!

''سنیتا میری ہے ——!'' یہی احساس کتنا روح افزا تھا، کتنا روح پرور تھا!!

شادی کی تیاریاں تقریباً مکمل تھیں مگر یکا یک دشمنوں کے ناپاک قدم مادرِ وطن کی پاک سرحدوں کو چھو گئے تھے اور جنگ کا اعلان ہو گیا تھا۔ سنیتا کے ڈیڈی نے مورچہ سنبھال لیا تھا۔ اس شام سنیتا بے حد مغموم تھی۔ میں نے اس کی دلی کیفیت محسوس کی۔ میں نے اسے بہلانے کی کوشش کی —— ''جنگ میں آخری فتح ہماری ہو گی! تمہارے ڈیڈی کامراں لوٹیں گے!''

''ڈیڈی جس عزم اور حوصلے کا احساس سینے میں بھر کر گئے ہیں وہ ضرور فاتح ہوں گے۔ مگر میں تو کچھ اور سوچ رہی ہوں!'' وہ بہت بجھے بجھے انداز سے بولی۔

''کیا سوچ رہی ہو بھلا ــــــ؟'' میں نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔

''میں سوچ رہی ہوں تم اپنی خدمات اپنے ملک کے لیے کیوں نہیں پیش کرتے؟ جب بھارت ماتا کی عظمت کو دشمنوں نے للکارا ہے تو تم سچے سپوت کی طرح اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کی کیوں نہیں سوچتے؟ تم بڑھ کر مشین گن کیوں نہیں سنبھال لیتے ــــــ!؟'' وہ بہت دلیری سے بول رہی تھی۔

''میں ــــــ؟ یہ تم کیا کہہ رہی ہو سنیتا ــــــ!؟ آخر تمھیں ہو کیا گیا ہے۔'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔ تمھیں کو کچھ ہو گیا ہے۔ تم اپنی خوشی کے آگے کچھ نہیں سوچ پا رہے ہوں۔ یہ کیسی خوشی ہے ــــــ!؟ میں اس خوشی کو غم کا نام دینا چاہتی ہوں!'' اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

''تم سوچتی کیوں نہیں، میری شادی ہونے والی ہے۔ میں اپنے باپ ماں کا ایک ہی بیٹا، ایک ہی اولاد ہوں۔ کہیں مجھے کچھ ہو گیا تو پھر میرے خاندان کیا ہوگا ــــــ!؟'' میں نے بہت انکساری سے کہا۔

''شادی ہونے والی ہے ــــــ! خاندان کا کیا ہوگا ــــــ!'' وہ تقریباً گرج پڑی۔

میں خاموش رہا۔

''دشمنوں سے لڑتے ہوئے تم شہید بھی ہو جاتے تو میں فخر سے سر بلند کر کے ساری دنیا سے کہہ سکتی کہ میرا منگیتر مادرِ وطن کے لیے شہید ہو گیا! وہ کتنا بہادر تھا ــــــ کتنا عظیم تھا ــــــ! لیکن میں نہیں جانتی تھی کہ تم اتنے بزدل، اتنے پست خیال ہو ورنہ میں تمھیں ہرگز پسند نہ کرتی!'' وہ رونے لگی تھی۔

''سنیتا ـــــ! بس کرو ـــــ بس!!'' میں بمشکل تمام اتنا کہہ سکا۔

''سنیتا تمہارے لیے مرچکی ہے۔ میں کل لداخ جارہی ہوں! میں نے ریڈکراس جوائن کرلی ہے۔ مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کرنا۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے!'' وہ تنک کی اٹھی اور بہت تیز رفتاری سے چلی گئی۔ میں اسے صرف دیکھتا رہ گیا۔ میں دیر تک وہیں بیٹھا بدلتے ہوئے حالات پر غور کرتا رہا، اپنے آپ پر غور کرتا رہا۔ سنیتا کی بلند کرداری کے متعلق سوچتا رہا۔ اس نے چاند بی بی کا کلیجہ، جھانسی کی رانی کا حوصلہ اور لیلیٰ خالد کا دماغ پایا تھا! اس کا کردار کتنا بلند ہے! وہ نرم و نازک ہوتے ہوئے بھی صحیح اصولوں کی کتنی پابند ہے۔ اس کے قول و عمل میں کتنی ہم آہنگی ہے، کتنا ربط ہے۔ وہ جہاں پیار اور محبت کی دیوی ہے، وہاں اصول پرستی کی تصویر بھی ہے۔ اپنے اصول پرستی کے خوفناک انجام سے بالکل بے پروا ـــــ یہ اس کے کردار ہی کے تو جوہر ہیں اور میں ـــــ میں تو اس سے اب آنکھیں ملانے کے بھی قابل نہیں۔ سنیتا کا ایک قابلِ پرستش روپ میرے سامنے تھا۔

دوسرے ہی دن میں فوج میں بھرتی ہوگیا۔ چھ ماہ کی تربیت کے بعد مجھے نیفا بھیج دیا گیا۔ سنیتا کے عزم سے جو مجھے تحریک ملی تھی وہ میرے لیے سب سے بڑی دولت تھی اور میرا دل اتنا پشیمان تھا کہ سنیتا کے سامنے جانے ہی کی سوچ کر نروس ہونے لگتا تھا۔ مگر پھر سوچتا اس کے دل میں پیار کی جو شمع کبھی فروزاں ہوئی تھی، اس کی روشنی اتنی بھی مندمل نہ ہوئی ہوگی۔ بس یہی ایک امید تھی جس پر زندہ تھا۔

میں نے لڑائیاں لڑیں۔ دشمنوں کے چھکے چھڑائے اور اپنے ملک کی پاک سرزمین کی سرحدوں سے اُن کے ناپاک قدم بالکل پیچھے ہٹادیے۔ ہمارے حوصلے بڑھتے رہے۔ جب ہم محاذِ جنگ پر ہوتے تو ایسا احساس جاگتا رہتا کہ میرے وطن کا ہر نوجوان میری مدد کے لیے میری پشت پر کھڑا ہے۔ میرے کانوں میں سردار بھگت سنگھ، چندر شیکھر آزاد، بسمل اور سکھ دیو کی آوازیں گونجتی رہتیں۔

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

میرے قدم جم جاتے۔ بلا کا عزم میرے دل میں پیدا ہو جاتا اور بازوؤں میں جیسے غیبی طاقتیں بھر جاتیں۔ توپ کے دہانے جدھر مڑ جاتے لاشوں کا انبار لگ جاتا۔ سبھی تعینات جوانوں کے چہروں پر ایک فاتحانہ رنگ تھا، ایک حسین چمک تھی۔

سردیوں کی ایک یخ بستہ رات میں ہماری چوکی پر اچانک ایک حملہ ہوا جس کے لیے ہم تیار نہ تھے اور دیکھتے دیکھتے سارا رنگ پھیکا ہو گیا۔ میں نے دشمنوں پر بے شمار گولیاں برسائیں لیکن آخر کار بری طرح زخمی ہو گیا اور جب آنکھیں کھلیں تو ملٹری ہاسپٹل کی یہ اکتا دینے والی فضا میں سانسیں لے رہا تھا۔

"اویناش ـــــ تم زیادہ مغموم نہ ہو۔ تمہارا آپریشن نہایت کامیاب ہوا ہے۔ اور تم پھر چلنے کے قابل ہو جاؤ گے ـــــ" میری کیفیت بھانپ کر نرس نے بہت ہمدردی سے کہا تھا۔

"آں ـــــ آں ـــــ مجھے بس کھڑا کر دو تا کہ میں پھر بندوق چلا سکوں۔ وطن کو ابھی میری بہت ضرورت ہے اور بس ـــــ" میں نے بہت اداسی سے کہا تھا۔

رفتہ رفتہ میرے پیر کا زخم بھرتا گیا۔ دایاں پیر تو بالکل ٹھیک ہو گیا۔ چھ ماہ بعد جب میں ہاسپٹل سے نکلا، جنگ بند ہو چکی تھی۔ مجھے ملٹری خدمات کے لیے اَن فٹ کر دیا گیا اور پنشن منظور کر کے ریٹائر کر دیا گیا۔ وہ دن میرے لیے قیامت سے کم نہ تھا! دشمنوں سے انتقام کا شدید جذبہ جو میرے سینے میں تڑپ رہا تھا نفرت کی آگ جو میرے اندر ہی اندر بھڑک رہی تھی، میری مجبوریوں پر بہتے ہوئے آنسوؤں سے سرد پڑتی جا رہی تھی۔ میں غم سے نڈھال ہو گیا اور یہ میری سب سے بڑی ذہنی شکست تھی۔

میں دہلی لوٹ آیا۔ ڈیڈی اور ممی بے حد مسرور ہوئیں۔ سنیتا کے متعلق کسی نے کچھ نہ بتایا۔ میں اب بھی سوچ رہا تھا، میرے متعلق اس کے نظریات اب کیا ہیں؟ لیکن

میں کیسے معلوم کرتا۔ میں اپنے آپ ہی میں پیچ وتاپ کھاتا رہا۔ اس غم کے کوہِ آتش فشاں کو سینے ہی میں دبائے رکھا۔ یہ ایک ایسا غم تھا جس میں میرا وجود ہی گھل کر رہ گیا تھا۔ میری روح زخمی ہو چکی تھی۔

ایک اداس سی شام کے پھیکے پھیکے لمحات میں میں اپنے آپ میں کھویا، اپنی روٹھی بہاروں کی دلفریبی واپس لانے کی باتیں سوچنے میں مشغول تھا کہ کسی کے قدموں کی سبک سی آہٹ نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے سامنے جو نظریں اٹھائیں تو میری روٹھی بہاروں کی رانی فضا میں مسکراہٹوں کی کلیاں چٹکاتی میری طرف بڑھتی آرہی تھی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا کیونکہ مجھے تنہائی میں ایسا اکثر نظر آیا تھا۔ لیکن وہ میری طرف بڑھتی ہی رہی۔ میں نے غور کیا تو وہ سنیتا ہی تھی۔ میں خوشی سے بالکل پاگل سا ہو گیا۔ بڑھ کر اسے اپنے سینے سے لگالیا اور صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

''سنیتا——!!''

''اویناش——!!!'' اس نے مرتعش آواز میں کہا۔

جب وہ میرے سینے سے الگ ہوئی تو اس کی پلکوں پر آنسو چمک رہے تھے۔ پتہ نہیں یہ آنسو غم کے تھے یا خوشی کے —— میں اس کی آنکھوں کی نیلگوں جھیل میں ڈوبا رہا۔ وہ بہت محویت سے مجھے دیکھتی رہی۔ جب اس کی نظریں میرے مصنوعی پیر پر پڑیں تو اس نے بہت انوکھے انداز میں کہا۔

''میں آج کتنی خوش ہوں کہ تم نے اپنے پیارے وطن کے لیے اپنی شجاعت کے اعلیٰ جوہر دکھائے ہیں۔ آج تم اپنا پیر کھو کر بھی مجھے قابلِ رشک نظر آرہے ہو۔ بالکل ویسا ہی خوبصورت شہزادہ! جس کا خاکہ میرے ذہن میں برسوں سے محفوظ تھا۔ مجھے اپنے انھیں قدموں میں جگہ دو اویناش——!'' شدتِ جذبات سے اس کا گلا رندھ گیا اور وہ میرے قدموں پر جھک گئی۔ میں نے جھک کر اسے اپنی بانہوں میں اٹھالیا!!

■❖■

......زندگی کہاں گزرے

آج مدتوں بعد مجھے تمہاری یاد آئی ہے۔ اور آئی ہے تو بس آتی ہی چلی گئی ہے۔ میں تڑپ اٹھا ہوں۔ تمہاری ایک ایک ادا، ایک ایک بانکپن کا انداز میرے ذہن میں بالکل اسی طرح محفوظ ہے جس طرح آج سے بیس برس پہلے تھا۔ میری آنکھیں چھلک چھلک پڑی ہیں۔ اِن بیس برسوں کی مدت میں میں نے اپنی آنکھوں سے کتنی بار اپنا خونِ جگر ٹپکایا ہے، کتنی ویران راتوں کو تمہارے تصور کے حسین عکس سے سجایا ہے، تمہاری آواز کے جادو کے احساس سے دل کو بے قرار کیا ہے، تمہاری ریشمیں زلفوں کی کالی گھٹاؤں کے خیالی بادل کو دل کے ویران اور پیاسی دھرتی پر برسایا ہے، جیون کے اندھیرے راستے پر تمہاری روشن آنکھوں کی شمع کو فروزاں پایا ہے، تمہاری مسکراہٹوں کی شگفتگی کو اپنے جلتے، تپتے سے زندگی کے لیل و نہار میں محسوس کر کے تازگی پائی ہے اور تمہارے جسم سے پھوٹی ہوئی چمپا چمیلی جیسی خوشبو نے میری مایوس زندگی میں رنگ بھر دیا ہے۔ میں نے اپنے حال کو ہمیشہ اپنے ماضی کے حسن کا فریب دیا ہے —— بہلاوا دیا ہے —— ایک امید بندھائی ہے۔ وہی ماضی جس کی ایک ایک دھڑکن میں تمہاری محبتوں کے نغمے گونج رہے ہیں اور مجھے جینے پر مجبور کیے ہوئے ہیں۔ اگر ماضی کے سائے نہ دیکھ پاتا، ماضی کی آواز نہ سن پاتا تو شاید کب ہی موت کو گلے لگا چکا ہوتا۔

وہ البیلی شام اب تک میری آنکھوں میں بسی ہوئی ہے، جس شام کو لالی میں تمہاری رنگ بھی گلنار ہو گیا تھا اور میں نے اپنی شوخ، چنچل طبیعت سے مجبور ہو کر تمہیں

جھیل کے کنارے تنہا پا کر چھیڑا تھا۔

''آپ کو کسی کا انتظار ہے کیا ـــــ؟!''

''نہیں تو ـــــ!!'' جیسے تم خواب سے چونک پڑی تھیں۔

''پھر خودکشی کا ارادہ ہے ـــــ؟'' میں نے اسی شوخی سے پوچھا تھا۔

''میں آپ کے اس ارادہ میں کہیں مخل تو نہیں ہو رہی ہوں ـــــ؟'' تم نے بہت بے باکی سے کہا تھا اور زیرِ لب مسکرا دی تھیں۔

''ہو سکتا ہے ـــــ! لیکن آپ کن حالات سے مجبور ہو کر ایسا قدم اٹھانا چاہتی ہیں ـــــ؟'' میں بہت روانی سے کہے جا رہا تھا ـــــ

''میرے ساتھ تو بڑی بڑی پریشانیاں ہیں۔ معاشی بدحالی، تنگ دستی، بیکاری، بے وفائی اور ایسی ہی بہت سی تلخیاں ـــــ''

''مجھے زندگی سے بے حد پیار ہے۔ میں جینا چاہتی ہوں، مگر جی نہیں سکتی ـــــ!'' تم نے بے حد ڈرامائی انداز میں کہا تھا۔

''آخر ایسی بھی کیا بات ہے ـــــ؟'' میں نے حیرت سے پوچھا تھا۔

''یہ دل کا معاملہ ہے کوئی دل لگی نہیں ـــــ!'' تم ترنم ریز تھیں اور ساری فضا تمہاری آواز کے جادو سے جھوم اٹھی تھی۔

تمہاری ہنسی کی دبی دبی راگنی فضا میں تیرنے لگی تھی اور میں تمہارے قریب سرکتا گیا تھا اور تمہارے بالکل قریب آ گیا تھا۔ تمہاری غلافی پلکیں مجھے اپنے قریب پا کر احساسِ حیا سے جھکتی چلی گئی تھیں اور میری آنکھوں نے شرم و حیا کے حسن کو پہلی بار اتنے قریب سے دیکھا تھا اور دل نے چاہت کی تیز سی آنچ محسوس کی تھی۔ دھڑکنیں گنگنا اٹھی تھیں اور شاید سارا ماحول ہی نغمہ بار ہو گیا تھا۔ اسی کیف و مستی کے عالم میں میرا ہاتھ تمہارے پھول سے بدن سے مس کر گیا تھا اور میں نے غور کیا تھا تم پر ایک لرزہ سا طاری ہو گیا تھا۔ پھر تم آنکھیں موندے میرے شانے سے آ لگی تھیں۔ تمہاری معطر زلفوں کے

جال میں میں الجھتا چلا گیا تھا۔

پھر تو شام کی ملاقاتیں معمول بنتی گئیں۔ اور شام کے دھڑکتے لمحات پھیلتے پھیلتے رات کی روشن تاریکیوں کے راگ بن گئے، جن کی دھن پر سارا عالم بے قرار سا ہو اٹھا تھا اور اسی بے قراری کے عالم میں میں نے اپنے سارے وجود کو تمہاری مسکراہٹوں کی ٹھنڈی چاندنی میں پگھلتے دیکھا تھا۔ گھلتے محسوس کیا تھا۔ میں نے تمھیں پا کر جیسے خود کو کھو دیا تھا۔

میرے دل کی یہ ساری بے قراری، نظروں کا یہ سارا تجسس، میری یہ دیوانگی، یہ تڑپ صرف مجھے اپنے لیے تھی، میں تم میں اپنے آپ کا متلاشی تھا۔ میں دور تک کھوجتا گیا۔ لیکن میں کہیں بھی تو نہ تھا—— میری یہ تلاش جاری رہی—— جاری رہی—— میں نے خود کو تلاش کرتے کرتے شاید تمہاری حقیقتوں کا سراغ لگالیا تھا کیونکہ تمہاری قربت کے لطیف احساسات نے میرے کانوں میں سرگوشی سی کی تھی اور جیسے تمہاری محبت کے سایوں نے مجھ سے کہا تھا—— ''تم جس راہ پر جاؤ گے بالآخر مجھ تک ہی پہنچو گے، جس راگ کو سنو گے میرے ہی آواز کا جادو تمھیں ملے گا، جس خوشبو کو محسوس کرو گے، اس میں میری ہی مہک پاؤ گے۔ پھولوں کے جو رنگ دیکھو گے، اُن میں میرے ہی حسن کی جھلک موجود ہوگی—— میں ستی ہوں—— میں یشودھرا ہوں—— میں تمہارے وجود کا سایہ ہوں—— ہاں سایہ—— جو کبھی جدا نہیں ہوسکتا۔ تمہاری ہی آواز ہوں—— تمہاری روشنی ہوں—— تم سے کبھی جدا نہیں ہوسکتی—— کبھی نہیں——!!''

مگر ایسا ہوا نہیں—— انسان جو کچھ سوچتا ہے وہ شاید پورا نہیں ہوتا۔ دنیا کا یہی دستور ہے۔ وہ سایہ غائب ہوگیا تھا اور میرے سارے وجود کو بالکل ہی ہلکا کر گیا تھا۔ ذرا سوچو جس وجود کا سایہ نہ ہو بھلا لوگ اس سے خوف نہ کھائیں گے۔ میرا وجود بے سایہ ہوگیا تھا اور اس نے اپنا سارا وزن کھو دیا تھا، ساری وقعت کھو دی تھی۔ جیسے پتنگ کی ڈور کٹ جائے تو وہ بے سہارا ہو جاتی ہے اور ہوا کے رحم و کرم پر فضا میں تیرتی رہتی ہے۔

بے مقصدسی، بے ٹھکانہ سی، میری بھی ڈورکٹ چکی تھی اور کاٹنے والے ہاتھوں کو میں جان سکتا تو شاید مروڑ دیتا، مگر وقت کے مضبوط ہاتھوں کو بھلا کس نے دیکھا ہے!—— کس نے توڑا ہے——!!

ایک خونی طوفان سارے ملک میں آچکا تھا۔خون کا دریا بہہ نکلا تھا۔گنگا جمنا کی پوتر لہریں ساکت وجامد ہوکر رہ گئی تھیں۔ ہمالیہ کی بلندیوں نے یہ نظارہ دیکھ کر خون کے آنسو بہائے تھے۔ لال قلعہ کے وقار نے سرنگوں کرلیا تھا، جامع مسجد کے بلند وبالا میناروں نے غارت گری کا کرشمہ دیکھا تھا۔سارا پنجاب کیف ومستی کی راگنی اور لہلہاتے کھیتوں میں گندم کے خوشوں کی جھنکار بھول چکا تھا۔اس کے جگر کے ٹکڑے ہوگئے تھے، سارا بنگال کراہ اٹھا تھا۔میرے دیش کی ساری دھرتی مجروح ہوچکی تھی۔ایک تاریخ نے دوملکوں کو جنم دے دیا تھا۔سرحدیں بنائیں گئیں۔تم ادھر جاؤ وہ اِدھر آئے! ایک عجیب افراتفری کا عالم تھا۔سبھی خزاں رسیدہ پتوں کی طرح بکھر گئے تھے۔سرسبز وشاداب چمن اجڑ چکا تھا اور میری جانِ بہار تم بھی اُسی خزاں کے جھکڑ میں نہ جانے کہاں گم ہوگئی تھیں اور میں پاگلوں کی طرح اپنے سائے کو ڈھونڈ تا رہا۔ ہرگلی، ہر کوچہ میں، دیوانہ وار تمہارا نام لے کر دوڑتا رہا—— بے تحاشہ—— مگر تم تو کہیں بھی نہ ملیں۔

میری زندگی تھک گئی تھی۔ میں تمھیں جتنا تلاش کرتا، تمہاری یادوں کے حسین نقوش دل کی عمیق گہرائیوں میں ابھرتے رہتے اور مجھے پہلے سے اور زیادہ مضطرب کرتے۔ میں اپنی ہی لاش کو اپنے شانوں پر ڈھوتا پھرا۔

مگر ایک موہوم سی امید کو کلیجے سے لگائے اب تک جی رہا ہوں کہ شاید تم زندگی کی اس راہ پر کبھی تو مل جاؤ گی۔ یہ میرا کیسا پاگل پن ہے——! یہ کیسی امید ہے——!!

میں کیسی حقیقتوں کا دھندلا دھندلا سا عکس دیکھ رہا ہوں؟ یہ کیسا خواب ہے جو خواب ہوتے ہوئے بھی حقیقت کا لبادہ زیب تن کیے ہوئے ہے—— میں اپنے آپ کو کب تک اس طرح فریب دیتا رہوں گا——!؟

"ماموں جان ــــ! اپالو گیارہ چاند تک پہنچ گیا ہے۔ چلئے نا ــــ ریڈیو کامینٹری ہو رہی ہے ــــ" پنکی خوشی میں اچھلتی میرے پاس آ گئی ہے اور میرے خیالات کا اپالو دھم سے زمین پر آن گرا ہے جو اپنے چاند کی تلاش میں گزشتہ بیس برسوں سے فضا میں چکر کاٹ رہا ہے۔ یہ پنکی بہت شریر ہے۔ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے کھینچتی ہوئی ڈرائنگ روم میں لے جا رہی ہے، جہاں میرے سارے بھانجے بھانجیاں اور بڑی آپی ریڈیو کو گھیرے ہوئے کامینٹری سن رہی ہیں۔

"ٹھہرو ــــ ٹھہرو ــــ چلتا ہوں۔ ذرا ایک سگریٹ تو پی لینے دو ــــ بابا ــــ"

میں پنکی کو گود میں اٹھا لیتا ہوں اور سگریٹ پیتا ہوا ڈرائنگ روم میں چلا جاتا ہوں۔ مگر میرا جی کامینٹری میں نہیں لگتا۔ مجھے تو اپنے چاند کی کھوج ہے۔ میں تھوڑی دیر بیٹھتا ہوں اور اکتا کر نکل بھاگتا ہوں۔ مجھے عجیب سی گھٹن محسوس ہوتی ہے۔ میں پھر اپنے بیڈ روم میں آ کر بستر پر گر پڑتا ہوں اور سوچتا چلا جاتا ہوں ــــ "اگر بڑی آپی نہ ہوتی تو میری زندگی کتنی ویران، کتنی اداس ہوتی۔ اُن کی شفقتوں ہی نے مجھے جینے پر مجبور کر دیا ہے۔ اُن کے بچوں نے میری اندھیری زندگی میں کچھ اجالے بھر دیے ہیں۔ میں ان میں کچھ دیر تو بھولا رہتا ہوں۔ کچھ دیر تو یادوں کے دریچے بند رہتے ہیں اور اختر بھائی نے تو میرے دل کے گھاؤ کو محسوس کیا ہے، مجھے اپنی مسکراہٹوں کا امرت پلا پلا کر اب تک زندہ رہنے پر مجبور کیا ہے۔ مگر میں نے زندگی کو ایک عجیب ہی رنگ میں دیکھا ہے ــــ!!؟"

اختر بھائی ہی کی تجویز پر نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے مقامی کالج میں لکچرر شپ کی تقرری قبول کر لی ہے۔ اپنی مشغولیت میں اپنے غم کا مداوا تلاش کرنے لگا ہوں ــــ ہاں نجمہ ــــ صرف بہلاوا ــــ جو میری زندگی کا جزو بن گیا ہے۔ ہر گام پر خود فریبی، خودستائی ــــ میری فطرتِ ثانی بن گئی ہے۔ اب تو صرف میں ہوں اور میری تنہائیاں! ان تنہائیوں کا زہر پی پی کر اب تک جی رہا ہوں۔ زندگی میں کوئی رنگینی، کوئی کشش، کوئی

حوصلہ، کوئی امنگ باقی نہیں۔ سارے حوصلے سرد پڑ گئے ہیں۔ وہ آنکھیں جو کبھی خوبصورت خواب دیکھا کرتی تھیں بالکل ویران ہو چکی ہیں۔ ان آنکھوں میں اب کوئی خواب نہیں بستے۔ خیالوں میں اب کوئی رنگین تتلی نہیں اڑتی۔ کوئی امید انگڑائی نہیں لیتی۔

میں نے اپنے آپ کو کتابوں کی دنیا میں کھو دینا چاہا ہے۔ مختلف موضوعات کا مطالعہ میرا معمول بن گیا ہے۔ تاریخ —— معاشیات —— سیاست —— فلسفہ —— ادب ——

''میں وہ نہیں ہوں جو میں ہوں'' میں وہ ہوں جو میں نہیں ہوں —— یہ ویت نام کی بے پناہ بربادیاں، عربوں پر اسرائیل کے جارحانہ حملے انسانیت کی پیشانی پر بدنما داغ ہیں۔ یہ برٹینڈرسل کی روح کو مجروح کریں گے۔ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ چنگیز اور ہلاکو اب بھی زندہ ہیں۔ مگر ہم امن چاہتے ہیں۔ کرشن کنہیا کی مرلی کی تانوں میں جو پیار کی حلاوت تھی، جو امن کا سندیش تھا وہی تان ہمیں پھر کوئی سنا دے۔ کسی بروٹس، کسی شائلاک کا وجود نہ رہے۔ چاند کی تسخیر اولادِ اعظم کی فتحِ عظیم ہے۔ اقبال کی روح گنگناتی ہے۔

کوئی قابل ہو تو ہم شان کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والے کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

میرے چاروں طرف بکھری ہوئی کتابوں کا انبار مجھے اپنے آپ میں ضم کرنے لگا ہے۔ کاغذ کے اس سمندر میں ڈوبتا چلا گیا ہوں —— گہرائیوں میں گہرائیاں ابھرتی گئی ہیں۔ میں کہاں ہوں —— کیوں ہوں —— مجھے کچھ پتہ نہیں —— روشنیوں کا سیلاب امڈ پڑا ہے۔ مجھے کچھ نہیں دکھائی دے رہا ہے۔ اتنی ساری روشنیاں کہاں سے ابل پڑی ہیں۔ میرے دل و دماغ میں ایک ہلچل سی پیدا ہو گئی ہے۔ میں بوجھل ہو گیا ہوں، بالکل مضمحل سا۔ روشنیاں کم ہوتی گئی ہیں۔ دماغ روشن ہوتا چلا گیا ہے۔ میرے دماغ کی گتھیاں اور گرہیں سلجھتی چلی گئی ہیں۔ ساری باتیں مجھ پر روشن ہو گئی ہیں۔ میرے دل و

دماغ کو ایک فرحت کا احساس ہوتا ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھے سب کچھ مل گیا ہے جیسے گوتم کو نروان مل گیا ہو!

میری ایک نئی زندگی کا آغاز ہوا ہے مگر اس نئی زندگی کی روح تمہاری یادوں کی پرچھائیاں ہی ہیں جو میرے دل و دماغ میں کلبلاتی رہتی ہیں، جس سے واقعی مجھے زندگی کا احساس ہوتا ہے۔ یادوں کی یہ پرچھائیاں ایک نہ ایک دن تمہارے روپ میں میرے سامنے ضرور آ کر کھڑی ہو جائیں گی اور میں تمہارے لیے اندر ہی اندر پگھلتا ہوا انسان، تمہیں اپنے اتنا قریب دیکھ کر بت بنا تمہیں تکتا ہی رہ جاؤں گا۔ خوشی سے میری آنکھیں چھلک پڑیں گی اور منہ سے کوئی پوری بات بھی نہ نکل سکے گی۔ ایسا ضرور ہوگا! میرا دل بہت یقین کے ساتھ یہ کہتا ہے۔ لیکن میرے دل کو یہ یقین آخر کیوں ہو گیا ہے؟

آج مدتوں بعد اسی جھیل کے کنارے تنہا بیٹھا تمہاری یادوں کے سائے دیکھ رہا ہوں۔ وہی جگہ، وہی ماحول، وہی سب کچھ ہے مگر تم نہیں ہو۔ پچھلی ساری باتیں یکبارگی یاد آنے لگی ہیں اور میں اپنے آنسو ضبط نہ کر سکا۔ شام کا سرمئی آنچل لہرا اٹھا ہے۔ میرے سامنے کے دھندلکوں سے ایک سایہ سا ابھرا ہے اور آہستہ آہستہ میری جانب بڑھتا چلا گیا ہے۔ سایہ کے خدوخال نمایاں ہوتے گئے ہیں۔ اکہرا جسم، ریشمیں زلفیں، چال میں مستی ـــــ میں بہت محویت سے اُس کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ اندھیرے میں جیسے کرن سی جاگ اٹھی ہے۔ وہ میرے قریب آتی گئی ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا میں نے اسے کہیں دیکھا ضرور ہے۔ میں نے ذہن پر زور دیا۔ مجھے یاد آیا۔ پہاڑی ڈھلوان والے ریسٹ ہاؤس میں، میں اسے پندرہ دنوں سے دیکھ رہا ہوں۔ شاید کوئی سیاح ہے۔ لیکن تنہا ہے۔ کسی مرد کو اُس کے ساتھ کبھی نہیں دیکھا۔ روزانہ شام کو ریسٹ ہاؤس کے لاؤنج میں، میں نے اسے تنہا بیٹھے دیکھا ہے۔ وہ میری طرف بہت چبھتی نگاہوں سے دیکھا کرتی ہے اور میں اس کی نگاہوں کی تاب نہیں لا سکا ہوں۔ اس لیے بہت تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا جھیل کی طرف نکل پڑتا ہوں۔ میں نے بارہا اس کی ان معنی خیز نگاہوں کا مفہوم سمجھنے کی کوشش

کی ہے، لیکن ہر بار ناکامی ہوئی ہے۔ اس کی نگاہیں بہت دور تک میرا تعاقب کرتی رہتی ہیں اور مجھے ایسا محسوس ہوا ہے جیسے مجھ سے کوئی کہہ رہا ہو—— ''یہ زندگی کا سفر تنہا طے نہیں ہوسکتا، مجھے اپنا ہم سفر بنالو——'' اور میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا دور تک نکل جاتا ہوں۔ یہ معاملہ تقریباً روز ہی پیش آتا ہے۔ میری سوچوں پر جیسے کسی کا قبضہ ہوتا چلا گیا ہے۔ میں اس کے سامنے سے گزرتے ہوئے کوئی بات سوچ نہیں پایا ہوں، میری ساری قوت جیسے زائل ہوجاتی ہے۔

وہ میرے بالکل قریب آتی گئی ہے۔ میں نروس ہوتا چلا گیا ہوں۔ خوشبو کا ایک لطیف جھونکا آیا ہے اور تمہاری یادوں کا عکس بکھیر گیا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا چلا گیا ہے جیسے تم میرے سامنے کھڑی مسکرا رہی ہو۔ وہ میرے قریب آکر بلا جھجک بیٹھ گئی ہے۔ میں گھبرا گیا ہوں۔ وہ بے حد دلربا انداز سے بولی ہے، اور مجھے ایسا محسوس ہوا ہے جیسے کہیں دور جلترنگ بج اٹھے ہیں۔

''میرے ساتھ چلو، ارشد——! میں تمہاری کھوئی ہوئی زندگی دینے کی کوشش کروں گی اور ہوسکتا ہے تم بھی میری وہ خوشی دے سکو، جس کی تلاش میں میں بھٹکتی پھر رہی ہوں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے درد کا درماں بن جائیں تو برا ہی کیا ہے——!!؟''

اور میں بغیر سوچے سمجھے اس کے ساتھ ہوگیا ہوں۔ مجھے ایسا محسوس ہوا ہے جیسے روحی کی شکل میں مجھے نجمہ مل گئی ہے!!

■❖■

جاگتی آنکھوں کا خواب

میرے کاؤنٹر پر آج وہ پھر کھڑی ہے۔ شاید یہ تیسری بار آئی ہے۔ خوشبو کا ایک طوفان آیا اور سارے ماحول کو مشکبار کر گیا۔

میں اس کی طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں جیسے اُس کے چہرے پر کچھ پڑھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اُس نے میری طرف بہت بے رخی سے دیکھا ہے۔ میرے اندر لرزہ سا طاری ہو گیا ہے۔ اُس کا چیک میرے ہاتھوں میں کانپنے لگا ہے۔ میں نے چیک کو غور دیکھا۔ دستخط کی جگہ صاف صاف بلقیس اقبال لکھا ہوا ہے۔ میں نے ایک بار پھر اُس کی طرف دیکھا ہے۔ وہ میری طرف دیکھ رہی ہے، جانی پہچانی نگاہوں سے۔ مجھے چکر سا آنے لگا ہے۔ میں کاؤنٹر سے ہٹ گیا ہوں اور اپنی جگہ ستیہ پال کو بھیج دیا ہے۔ وہ سب سے ڈیل کر رہا ہے۔ میرے کانوں میں بس ایک ہی آواز باز گشت کی طرح گونج رہی ہے —— 'تم بزدل ہو —— ساری دنیا سے کہہ دو کہ تم مجھ سے شادی کرو گے۔ اگر نہیں کہہ سکتے تو پھر یہ پیار و محبت کا جھوٹا ڈرامہ بند کرو اور مجھے مایوسیوں کے اندھیروں میں ڈوب جانے دو! سمجھے ——!' میں ایک سال پہلے کے بیتے ہوئے لمحات کی دھڑکنیں صاف صاف سن رہا تھا۔

میں خلاء میں صرف گھور رہا تھا۔ اُس کی سسکیاں سارے ماحول کو بوجھل بنا چکی تھیں۔ میں نے اُسے ڈھارس دی تھی —— 'جیروس! مجھ پر اعتماد کرو۔ میں صرف تم سے محبت کرتا ہوں اور تمہارے لیے ساری دنیا سے بغاوت کر سکتا ہوں! تم میری زندگی ہو!'

اُس کی زلفیں میرے شانوں پر پریشاں ہوگئی تھیں اور سسکیوں کا تار تقریباً ٹوٹ چکا تھا۔
میں دیر تک اپنے آپ پر پیچ وتاب کھاتا رہا۔ شام کی چائے ہم دونوں نے Veez میں پی
اور رات گئے اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ جب لوٹا تو رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ میں عجیب سی
کشمکش میں مبتلا تھا۔ ایک انجانا سا درد، ایک اجنبی سا کرب میرے سارے وجود پر طاری
تھا۔ ایک عجیب سی بے چینی دل و دماغ کو بوجھل کر رہی تھی۔ میری حالت اُس راہی کی
طرح ہو رہی تھی جس کی منزل اندھیروں میں گم ہوگئی تھی۔

جیروس میرے محلہ میں رہتی تھی۔ نہایت الھڑ اور شوخ سی دوشیزہ۔ میں اکثر اس
کی طرف للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھا کرتا تھا۔ ایک دن اُس نے مجھے ٹوکا ـــــ

''اے جناب! آپ مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہیں؟ خدارا اپنی نگاہوں کی زبان
سے مجھے پریشان نہ کیا کیجیے ـــــ! سمجھے ـــــ؟''

میں اُس کی بے باکی پر ششدر رہ گیا۔ میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ وہ بادِ صبا کی
طرح اٹھلاتی ہوئی گزر گئی۔ میں دم بخود رہ گیا۔ میں نے سوچا یہ عجیب لڑکی ہے، کتنی نڈر
اور بے باک! دوسرے ہی دن وہ چرچ کے صدر گیٹ پر ملی۔ وہ تنہا تھا اور ایوننگ پریر
سے واپس ہو رہی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر رک گئی اور زیرِ لب مسکراتی رہی۔ میری ہمت بڑھی
اور میں نے اُس سے کہا ـــــ ''گڈ ایوننگ ـــــ!'' ـــــ ''گڈ ایوننگ ـــــ!'' جیسے
جلترنگ بج اٹھے۔

''میں اپنی گستاخ نگاہی کے لیے آپ سے معذرت خواہ ہوں!''

''دیکھئے آپ نے پھر پیار سے دیکھا مجھ کو ـــــ'' ایک شریر مسکراہٹ اُس
کے لبوں پر مچل اٹھی اور ایک ترنم فضا میں تیر گیا۔

''آپ کی شکایتوں میں محبت کی خوشبو گھل گئی ہے۔ میری پریشانی دور کیجیے
ـــــ!'' میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

''میں آپ سے پیار کرتی ہوں ـــــ!'' اس کی معطر زلفیں میرے شانوں پر

بکھر گئیں۔ میں اس کی سانسوں کے زیر و بم میں کھو گیا۔ ایک حسین خواب کی تعبیر مجھے مل گئی تھی۔ بہاروں کے سپنے مہک اٹھے تھے۔ لمحات کے تاروں سے خوشیوں کی راگنی بہہ نکلی تھی، جس کی مسحور کن لے پر میرا سارا وجود تھرک اٹھا تھا۔ میرے ویران سے دل میں چاہت کا شاداب سا چمن کھل اٹھا تھا۔ میری بے کیف سی زندگی میں ایک چاہنے والے کی مرادوں کی دنیا آباد ہو گئی تھی۔ زندگی آرزوؤں کا مسکن بن گئی تھی۔ میں اپنے آپ پر قابو پاکر بہت مشکل سے اتنا کہہ سکا ——— آپ نہیں ——— تم کہو میں بھی تم سے پیار کرتا ہوں ———، وہ میرے سینے سے لگی مسکراہٹوں کے پھول برساتی رہی۔

وہ شام میری زندگی کی اہم ترین شام تھی۔ جیروس میرے ساتھ رات گئے تک گھومتی رہی۔ جب میں اس سے جدا ہوا تو ایک خلش میرے جگر میں سما چکی تھی۔ دل بری طرح پیچ و تاب کھاتا رہا۔ میرا دل ایک ایسی حقیقت سے آشنا ہو گیا تھا جس کی تڑپ روزِ اول ہی سے میرے خون کی ایک ایک بوند میں لرز رہی تھی، جس کے لیے میری زندگی کے ایک ایک لمحے نہ جانے کب سے منتظر تھے ——— ہاں ——— منتظر ہی تو کہوں گا۔ لمحے ایک بار شاید تھم گئے تھے۔ وقت ہی رک گیا تھا۔ جب میری نگاہوں سے دبیز بادلوں کے جھنڈ چھٹنے لگے تو ایک کرن جاگی تھی۔ میری آنکھیں چکا چوند ہو گئی تھیں۔ اس پری جمال کے انگ انگ سے حسن ضوفشاں تھا۔ بادل سمٹ کر اس کی زلفوں میں سما گئے تھے۔ ایک گھٹا تھی جو چھائی جا رہی تھی۔ لبوں کی سرخی یاقوتی رنگ لیے عارض کا حسن بڑھا رہی تھی۔ مخمور آنکھیں فضا میں کیف و مستی کی شراب لنڈھا رہی تھیں۔ گورے بدن سے چاندنی پھوٹ رہی تھی۔ وہ مسکراتی ہوئی میری جانب دھیرے دھیرے ہولے ہولے اس طرح بڑھ رہی تھی جیسے کوئی ساقی مست خرام اپنی تمام تر نزاکتوں کو شراب میں گھول کر ہاتھوں میں جام چھلکاتا بڑھ رہا ہو اور رند کی پیاس تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی ہو۔ پائل کی چھم چھم ساری فضا کو نغمہ بار کر رہی تھی۔ میرا اشتیاق بڑھتا جا رہا تھا۔ میں چاہتا تھا جا کر اس کا ہاتھ

تھام لوں۔ مگر میری قوت نہ جانے کیوں صلب ہو چکی تھی۔ میں اسے اپنی طرف بلانے کی کوشش کرتا رہا لیکن گھٹی گھٹی سی آواز فضا میں تحلیل ہوگئی تھی۔ وہ میری آرزوؤں کی طرح مسکراتی مجھے بلا رہی تھی۔ میں ایک عجیب کشمکش میں مبتلا تھا۔ پھر یکا یک ایک تیز سی بجلی کڑکی اور زوروں کی ہوا چلی۔ دبیز بادل پھر پھیلنے لگے۔ وہ بادلوں میں کھوئی چلی گئی۔ اس کا سراپا دھندلا ہوتا گیا۔ میں زور زور سے چیخنا چاہتا تھا ـــــ تم رک جاؤ ـــــ میں آرہا ہوں ـــــ مگر میری آواز نہ جانے کہاں گم تھی۔ میری آنکھیں اشکبار ہو اٹھیں۔ آنکھوں سے لہو کی بوندیں گر گر کر میرا دامن بھگوتی رہیں۔ میں زور سے چیخ اٹھا ـــــ رک جاؤ ـــــ! میری آنکھیں کھل گئی تھیں۔ وہ کہیں بھی تو نہ تھی! یہ خوابوں کی شہزادی اکثر مجھے اپنی طرف بلاتی رہی تھی اور میں آنکھوں سے لہو کی بوندیں گراتا رہا تھا۔ یہ لہو میرے دامن کو داغدار بنا رہا تھا۔ میں اکثر سوچتا میرے لاشعور میں یہ کس کا عکسِ جمیل منقش ہو گیا ہے؟ کون ہے جو میرا منتظر ہے؟ اِن آرزوؤں کی تکمیل آخر کہاں ہے؟ ایک مستقل تجسس جو میرے اپنے آپ میں جاری تھا۔ ایک انجان سا درد تھا جو میرے سارے وجود پر پھیلتا جا رہا تھا۔ ایک کشمکش تھی جو بڑھتی جا رہی تھی۔

اور ایک شام ـــــ

جب جیروس کو دیکھا تو وہ ساقی مست خرام میری نظروں کے سامنے گھوم گیا۔ میری خوابوں کی محفل ویران کر کے وہ مجسم قیامت مجھ سے شکوہ کر رہی تھی ـــــ "اپنی نگاہوں کی زبان سے مجھے پریشان نہ کیا کیجیے۔" میں بظاہر اس کے سامنے تھا مگر ذہن میں وہ خوابوں کی کرن جاگ اٹھی تھی۔ سپنے بھی اس طرح سچ ہوتے ہیں ـــــ!؟ یہ تو میری جاگتی آنکھوں کا خواب تھا شاید!

میری روح کی گہرائیوں میں جیروس کے پیار کی شمع روشن ہو چکی تھی۔ میں زندگی کے ہر موڑ پر اُسے اپنا ہم سفر پاتا۔ اس کے پیار کی کرنوں نے میرے اندھیارے

جیون میں نئی جوت جگادی تھی۔

اچانک میرا تبادلہ رانچی ہوگیا۔ جدائی کے جان لیوا احساس سے ہی جیروس بے حد مغموم تھی اور جب میں اس سے جدا ہوا تو اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے تھے۔ میں جدائی کا غم لیے رانچی چلا گیا۔ خطوط آتے جاتے رہے۔ جدائی کے احساس کا زخم رفتہ رفتہ مندمل ہوگیا۔ جیروس کے حالیہ خطوط میں میرے لیے دعوتِ فکر تھی۔ اس نے بہت بے تکلفی سے لکھا تھا ـــــ

''اسلم ! میں نے اپنی ممی کو راضی کرلیا ہے۔ وہ میری خوشی کے لیے ہر وہ قدم اٹھا سکتی ہیں جو میں چاہوں گی۔ صرف تم ہاں کردو، میں تم سے بلقیس بن کر شادی کرلوں گی ـــــ اب یوں چھپ چھپ کر ملنا زیب نہیں دیتا۔ یہ میرا آخری اور اٹل فیصلہ ہے!

تمہارے لیے بے چین

جیروس ـــــ''

میری الجھنیں بڑھ گئیں۔ ایک طرف خاندانی رواداری، سماجی بندھن اور دوسری طرف محبتوں کے نقوش! میں اسے کیا جواب دوں؟ ہفتوں سوچتا رہا۔ میری خاموشی اسے گمراہ کرتی رہی۔ اس نے بار بار لکھا ـــــ ''تمہاری خاموشی سے مجھے ڈر لگ رہا ہے ـــــ'' میں نے اسے پورا یقین دلایا کہ میں وہی کروں گا جو وہ چاہے گی۔ مگر ذہنی طور پر بے حد الجھا رہا۔ میری پریشانیوں کو ابا کے ایک خط نے اور بھی بڑھا دیا۔ انھوں نے لکھا تھا ـــــ ''اسلم ! میں تمہاری اب کچھ نہ سنوں گا۔ تم برسوں سے شادی کے معاملے کو ڈالتے رہے ہوں۔ میں نے اجمل صاحب کو زبان دے دی ہے اور تمہاری شادی کی تاریخ بھی مقرر کرلی ہے۔ ۱۲؍اور ۱۳؍اپریل! تم جلد رخصت لے کر چلے آؤ ـــــ دعا گو کریم''

میں حالات کے دلدل میں بری طرح پھنستا گیا۔ میرے لیے بہت ہی

بھیانک مستقبل اور میری محبت کے لیے بے حد ہی دردناک انجام منتظر تھا۔ میری سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ کیا کروں؟ میں ایک ایسے موڑ پر رک گیا تھا جہاں چاروں طرف کھائی ہی کھائی تھی۔ ذرا سا قدم ڈگمگائے اور میں ناکامیوں کے اندھیرے غار میں جا پڑتا! نہ کوئی ہمدرد اور نہ کوئی ہمراز۔ میری تنہائیاں تھیں جو طرح طرح کے روپ دھار کر میرے سامنے آتی رہتی تھیں۔ میرے حوصلے جواب دے رہے تھے۔

جب میں رخصت لے کر پہنچا تو شادی کے صرف دو دن باقی تھے۔ جیروس کو میری شادی کی خبر ہوگئی تھی۔ جب میں اس سے ملا تو اس کا چہرہ رنج و غم کے اثرات سے تمتما رہا تھا۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ برہمی سے بولی —— ''تم بزدل ہو۔ ساری دنیا سے کہہ دو کہ تم مجھ سے شادی کرو گے! اگر نہیں کہہ سکتے تو یہ پیار و محبت کا جھوٹا ڈرامہ بند کرو اور مجھے مایوسیوں کے اندھیروں میں ڈوب جانے دو! سمجھے —— ؟''

''تم نے مجھے غلط سمجھا ہے جیری —— ! میں تمہارا ہوں اور ہمیشہ تمہارا ہی رہوں گا!'' میں نے بہت نرمی سے کہا۔

''اپنی چکنی چپڑی باتیں رہنے دو۔ کل کو تمہاری شادی ہو جائے گی اور تم سب کچھ بھول جاؤ گے۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میرا بھی دل بھر آیا۔ میں محبت میں ناکام ہوتا جا رہا تھا۔ مگر ایک جذبہ تھا جو بے وفائی کا الزام سر پر نہ لینے کو اکسا رہا تھا۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا تھا کہ ایک معصوم کا دل توڑ کر میں گناہِ عظیم کا مرتکب ہو رہا ہوں!

میں نے ایک منصوبہ بنایا اور جیروس کو راضی کر لیا۔

جیروس نائٹ ٹرین سے رانچی کے لیے روانہ ہوگئی اور مجھے اپنی موٹر سائیکل سے کل رانچی پہنچ کر سول میرج کر لینا تھا۔ شادی کی ساری تیاریاں دھری رہ جائیں! جیروس خوش تھی۔ میں نے بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ اس محبت کی دیوی کو جیون ساتھی بنا لوں۔

دوسرے دن بغیر کسی کو اطلاع دیے رانچی کے لیے روانہ ہوگیا۔ موٹر سائیکل

تیزی سے فاصلہ طے کرتی رہی۔ میرا ذہن ماؤف سا ہوتا جا رہا تھا۔ ذہنی طور پر میں بہت پریشان تھا۔ میں اپنی چاہت پر سب کچھ قربان کرنے جا رہا تھا۔ سماجی وقار، خاندانی وجاہت اور سب سے بڑھ کر ابا اور دوسرے اقرباء کی عزت! جب میرے فرار کی خبر تمام میں پھیلے گی تو بیچارے ابا کیا کریں گے؟ میرے لیے گھر کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گی۔ میں سب کی تذلیل کا باعث ہوں۔ بیٹا خاندان کا نام روشن کرتا ہے مگر میں ایسا بدنصیب ہوں کہ اپنے خاندان کو ذلت و رسوائی بخش رہا ہوں! کیا کروں دل کے ہاتھوں مجبور ہوں مگر محبت کے مقدر میں رسوائیاں ہیں۔ میں نے زندگی میں رسوائیوں ہی کا تو انتخاب کیا ہے۔ محبت اِن رسوائیں کو اپنی معراج سمجھتی ہے۔ مجنوں نے دربدر کی ٹھوکریں کھائیں، فرہاد پہاڑوں سے ٹکراتا رہا، رانجھا دریا کی طغیانی میں کود پڑا۔ یہ سب محبت کی معراج ہی تو تھی۔ اُن کے افسانے رہتی دنیا تک دہرائے جاتے رہیں گے۔ محبت کا نور سارے عالم میں ضیاء بار ہے۔

میں خیالات کے ریشمی دھاگوں میں الجھتا رہا۔ موٹر سائیکل ہوا سے باتیں کرتی رہی، ناگاہ میں ایک موڑ پر سامنے سے آتے ہوئے ٹرک سے جا ٹکرایا۔ میں ہوا میں غبارے کی طرف اچھل گیا۔ جب میری آنکھیں کھلیں تو میں ہزاری باغ کے ہسپتال میں بری طرح زخمی پڑا تھا۔ میرا سارا بدن درد میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے ماحول کا جائزہ لیا۔ ڈاکٹر اور نرس کے سوا میرے اردگرد کوئی نہ تھا۔ ڈاکٹر نے میری نبض ٹٹولی اور بہت پیار سے پوچھا—— ''آپ کی طبیعت کیسی ہے؟''

''——'' میں اسے گھورتا رہا۔ میری زبان گنگ ہو چکی تھی۔ پھر ایک غنودگی کا عالم طاری ہوتا گیا۔ میں ڈوبتا گیا ڈوبتا گیا—— دور سے شہنائیوں کی مدھم مدھم آوازیں آتی رہیں۔ میری آنکھوں تلے رنگ برنگی تتلیاں اڑتی رہیں—— لال—— پیلی—— نیلی—— سفید—— تتلیوں کا سمندر سا اُمڈ پڑا تھا۔ ایک آتی دوسری جاتی۔ یہ سلسلہ

لامتناہی ہوتا گیا۔ سارا آسمان رنگین ہوگیا تھا۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس پار دیکھنا چاہتا تھا لیکن کچھ بھی نظر نہ آتا تھا۔ میں بانہیں پھیلائے تتلیوں کے جھنڈ میں دوڑ پڑا۔ تتلیاں بکھرنے لگیں۔ میں بہت دور تک دوڑتا چلا گیا۔ سامنے ایک نیم تاریک سا میدان تھا جس میں کچھ سائے تھرک رہے تھے۔ میں آہستہ آہستہ آگے بڑھتا گیا اور سایوں کے قریب ہوتا گیا۔ قریب پہنچ کر میں نے کچھ لوگوں کو دیوانہ وار سامنے سے پھوٹتی ہوئی کرن کی طرف بری طرح جھپٹتے دیکھا۔ لیکن وہ سب کے سب آہنی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ سب اپنی اپنی جگہ پر مچل رہے تھے۔ کرن کی جوت تیز ہوتی گئی۔ کچھ چہروں کے خدوخال نمایاں ہورہے تھے۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے اپنے ایک ہم شکل کو بھی بندھن میں جکڑا ہوا پایا۔ میں اس کے قریب گیا اور اسے غور سے دیکھتا رہا۔ اس نے مجھے کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھا اور بولا —— ''میں تمہاری بزدلی ہوں۔ تمہارے اندر چھپے ہوئے کردار کا ایک روپ! میں نئی زندگی کی روح چاہتا ہوں، روشنی چاہتا ہوں، لیکن میری فطرت مجھے اپنے بندھوں میں بری طرح جکڑے ہوئے ہے —— وہ دیکھو —— سامنے سے پریم کی دیوی نمودار ہورہی ہے۔ اُس کے رخِ زیبا سے کیسی جوت جاگ رہی ہے۔ لیکن میں اس کے قریب نہیں جاسکتا۔ جانے کی ہمت کرتا ہوں لیکن فوراً سوچتا ہوں آگے کوئی سماجی رسم و رواج کی بڑی سی خلیج ہوگی! اور قدم خود بخود تھم جاتے ہیں۔ دل دھڑکنے لگتا ہے اور میں نروس ہوجاتا ہوں ——'
اُس کی سسکیاں فضا میں گھلنے لگی تھیں۔ میں نے سامنے نگاہ اٹھائی تو جیروس آسمانی حور کی طرح زرق برق لباس میں ملبوس ایک بلند مقام پر پُر وقار انداز میں کھڑی مسکرا رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کوئی اپسرا آکاش سے اتر آئی ہے۔ اُس کے حسن کی روشنی سے سارا ماحول منور ہوگیا تھا۔ لوگوں کے سائے اُس کی طرف بڑھنے کی کوشش کررہے تھے۔ میں جیروس کو دیکھتے ہی اس کی طرف دوڑا۔ لوگوں کو روندتا ہوا بڑھتا گیا۔ میں اس کے قریب

ہی پہنچ چکا تھا لیکن زمین گردش کرنے لگی۔ مجھے چکر آ گیا۔ میں زمین پر چکرا کر گر پڑا اور مجھے ایسا محسوس ہوا نیچے سے زمین سرک گئی تھی اور میں کسی کھائی میں گرتا گیا۔ میری چیخ نکل پڑی ـــــ زوروں کی چیخ اسپتال کے وارڈ میں بلند ہوگئی۔ میں نے آنکھیں کھولیں۔ میرے اردگرد ڈاکٹر اور نرسیں تھیں۔

میں چھ ماہ تک زندگی اور موت کے درمیان سانسیں لیتا رہا۔ اسپتال اتھارٹیز نے میرے ابا کو ٹیلی گرام سے خبر کی۔ وہ آئے لیکن اُن کے چہرے پر غم وغصہ کی گہری لکیریں ابھری ہوئی تھیں۔ جیروس کو نہ جانے کیا کیا بدگمانیاں ہوتی رہی ہوں گی۔ مجھے اُس کی کوئی خبر نہ تھی۔

جب میں نے اسپتال چھوڑا تو بیساکھیوں کو سہارا بنانا پڑا۔ میں سیدھا رانچی پہنچا اور بینک میں ڈیوٹی جوائن کرلی۔ سبھی لوگوں کو میرے اس حادثے پر مجھ سے ہمدردی تھی۔ لیکن میرے دل میں ایک پھانس تھی جو مجھے ہر پہلو مجروح کرتی رہی۔ میں جیروس کو کیا منہ دکھاؤں گا؟ اس کی زندگی میں جو کرب، جو مایوسیاں، جو ناکامیاں میں نے سمودی ہیں، بھلا اس کی تلافی کیسے کرسکوں گا؟ میرے اندر ایک قیامت برپا تھی۔ میں اسے منہ دکھانے کے قابل بھی تو نہ تھا۔ نہ جانے اُس کی زندگی نے کیا موڑ لیا ہو ـــــ!

ناگاہ آج سے تین دن پہلے وہ میرے ہی کاؤنٹر پر کھڑی تھی!

میں نے اس کی طرف دیکھا تو کانپ گیا۔ اس نے نفرت سے اپنا منہ پھیر لیا تھا۔ میرے آنسو امڈ پڑے تھے، میں کچھ بول نہ سکا اور آج پھر وہ میرے ہی کاؤنٹر پر کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ نکھر گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا اس نے زندگی سے صلح کرلی تھی اور کافی مطمئن تھی۔

جب میں خیالات کے گرداب سے نکلا تو ستیہ پال میرے سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھ رہا تھا۔ کاؤنٹر خالی ہو چکا تھا۔ میں نے بیساکھی سنبھالی اور جلدی جلدی باہر گیٹ کی

طرف نکل پڑا تا کہ اپنے دل کا درد جیروس سے کہہ سکوں۔ اس سے کہہ سکوں کہ میں نے ایک نئی زندگی شروع کی ہے۔ تمہارے پیار ہی نے موت کو شکست دی ہے۔ لیکن میرے گیٹ تک پہنچتے پہنچتے ایک کار تیزی سے نکل گئی جس میں پچھلی نشست پر جیروس شہر کے مشہور ڈاکٹر اقبال کے پہلو میں بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ کار کے شیشے کا ریڈ کراس دور دور تک چمکتا رہا اور آہستہ آہستہ سمٹتا ہوا ایک نقطہ سا بن گیا بالکل ایک قطرۂ خون کی طرح جو میں نے اکثر اپنی آنکھوں سے ٹپکائے تھے!

میں دیر تک کھڑا سوچتا رہا۔ میں جیروس—— نہیں—— اب تو بلقیس اقبال کو اس کی کامیاب زندگی پر مبارکباد کیسے دوں اور یہ کیسے بتادوں کہ اس نے مجھ سے انتقام کے پیشِ نظر جو اپنی شادی کر لی ہے وہ اس کا نہایت منصفانہ قدم ہے، کیوں کہ حادثہ کے بعد میں تو شادی کے قابل بھی نہ رہ گیا تھا۔

■❖■

پیار کی روح

بمبے میل تیزی سے بھاگا جا رہا تھا!

اور میرا ذہن حالات کی پیچیدگیوں میں الجھا ہوا مشکلوں کا حل ڈھونڈنے میں منہمک تھا۔ آسام کے جنگلی علاقوں میں پورے ایک سال تک جیولاجیکل سروے میں سر مارنے اور دیدہ ریزی کرنے کے باوجود مجھے پھر مدھیہ پردیش کے ایک غیر آباد علاقے میں جانے کا حکم صادر کر دیا گیا تھا۔ آسام کے دور دراز علاقوں میں جن صبر آزما گھڑیوں میں میرے دن رات کٹے تھے اس کا تصور بھی اب میرے لیے بے حد اذیت ناک تھا۔ اُس حکم کے بعد ذہنی سکون اور جسمانی آرام حاصل کرنے کی خواہش ایک دیوانے کا خواب بن کر رہ گئی تھی۔ سروے گروپ کے تقریباً سبھی افراد بالکل بوجھل سے دل و دماغ کے ساتھ کلکتہ صدر دفتر واپس ہوئے تھے۔ اس بار گروپ میں کچھ ردوبدل کر کے مجھے گروپ کے دوسرے افراد سے پہلے ہی بلاس پور پہنچ جانے کو کہا گیا تھا اور دوسرے ہی دن میں چل پڑا۔

فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں میرے علاوہ دو اور مسافر تھے۔ ایک ہندوستان اسٹیل پروجیکٹ کے انجینئر مسٹر گوندرارجن اور دوسرے ناگپور کے بہت بڑے تاجر مسٹر وی سی داردکا۔ میرے ڈبہ میں داخل ہونے کے چند ہی ثانیے بعد اُن دونوں کی سوالیہ نگاہوں نے مجھے اُن سے متعارف ہونے کو اکسایا اور پھر ہم تینوں اس طرح گھل مل گئے جیسے مدتوں کے پرانے ساتھی ہوں۔

نومبر کی ہلکی پھلکی سنہری دھوپ ہر طرف پھیل چکی تھی، پھر بھی فضا بوجھل سی معلوم ہورہی تھی۔ نہ جانے کیوں!؟

جب ٹرین کسی بڑے اسٹیشن پر رکی تو ریفرشمنٹ روم کے بیرے ناشتہ اور چائے لیے ڈبہ میں داخل ہوئے۔ ہم تینوں نے ایک ساتھ ناشتہ کیا اور گرم گرم چائے کی چسکی لے ہی رہے تھے کہ ایک صاحب اندر داخل ہوئے —— 'یہ تو اجیت ہے ——! میرا اجیت ——!!' میرے دل نے کہا۔

''ارے یار اجیت! تم کہاں سے نکل پڑے ——!!؟'' میں اجیت سے لپٹ گیا۔ اجیت بھی فرطِ انبساط سے کھل پڑا تھا۔ مجھے سینے سے لگائے دیر تک کھڑا رہا۔ جب میں اس سے جدا ہوا تو وہ میری برتھ پر بیٹھ گیا اور بولا —— ''عظیم! تم اتنی مدتوں تک کہاں غائب رہے؟ ارے یار ——! اپنے اجیت کی بھی تو کبھی خبر لی ہوتی ——!!''

''میں نے تمھیں بہت ڈھونڈا میرے دوست —— لیکن تم نہ ملے!!''

ہم بہت دیر تک بہت ساری باتیں کرتے رہے —— اجیت میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی تھی۔ وہ آج کل بھی کالج کا وہی اوباش، بےفکر اور ہنس مکھ سا نوجوان تھا جو آج سے دس برس پہلے تھا۔ بات بات پر اس کے قہقہوں کا فوارہ پھٹ پڑتا تھا۔ میری ساری اداسی، ساری تھکان اجیت سے اچانک ملاقات سے کافور ہوگئی۔ بہت لطف آ گیا تھا۔

....

اجیت میرا کلاس میٹ تھا۔ ہم دونوں ہوسٹل میں بھی ایک ہی روم میں رہتے تھے۔ روم کے باہر اجیت نے Azim & Ajit کا نیم پلیٹ لگا رکھا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم کالج میں A & A کے نام سے مشہور ہوگئے۔ ہم دونوں کے مزاج میں حیرت انگیز ہم آہنگی تھی، حیرت انگیز یگانگت تھی۔ میری ساری پسندیدہ چیزیں اجیت کو بھی پسند تھیں۔ یہاں تک کے ہمارے لباس کے شیڈ بھی ایک جیسے ہوا کرتے رہے۔ ایک ہی فلمیں دیکھتے اور ہم دونوں کا تبصرہ بھی ایک ہوا کرتا تھا۔ البرٹو مورا دیا ہمارا پسندیدہ ادیب تھا۔

اس کی کتابیں ہم ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھا کرتے تھے۔ اجیت جب بھی تعطیل میں جاتا موراد یا کی بہت ساری کتابیں خرید لاتا۔ ایک بار جب اجیت اپنے ڈیڈی کے پاس گوپال پور آن سی گرمیاں گزارنے گیا تو اس نے مجھے ٹیلی گرام دے کر بلا لیا۔ جگہ بہت ہی رومان انگیز تھی۔ سمندر کے ساحل پر دور تک پھیلے ہوئے شہر میں بلا کی رعنائی تھی، بلا کی رنگینی تھی۔ یہاں کی شام بہت روح پرور ہوتی تھی۔ سمندر کے کناروں پر بڑے بڑے ہوٹلوں کی عمارتیں جب روشن ہوتی تو سمندر کے صاف و شفاف پانی کی سطح پر گنگا جمنی قوسِ قزح سے بکھر جاتی اور فضا خود بخود گنگنا اٹھتی تھی۔ جیسے جیسے رات کے سائے بڑھتے جاتے شہر کی جوانیاں سمندر کی ٹھنڈی ٹھنڈی ریت پر بکھر جاتیں اور جب چھوٹی چھوٹی کشتیاں اپنے دامن میں حسین و جمیل جوڑوں کو سمیٹے سمندر میں مچلتی لہروں کے سینے پر تیرنے لگتیں تو ایسا معلوم ہوتا سطحِ آب پر رنگ برنگے کمل کھل اٹھے ہیں اور دیکھنے والوں کے دل و دماغ میں ایک ہیجان برپا ہو جاتا۔

....

اجیت خلافِ معمول بہت سنجیدہ نظر آیا۔ میں نے پہلے تو اتنا خیال نہیں کیا۔ لیکن باتوں ہی باتوں میں وہ ابل پڑا۔ وہ ایک کرسچین لڑکی سے پیار کرنے لگا تھا۔ میں نے جب اس کے ڈیڈی سے کہہ دینے کی دھمکی دی تو اس نے بہت معصومیت سے کہا ——

''یار! بگڑتے کیوں ہو؟ اس کی بڑی بہن کو تمہارے لیے بھی پسند کر رکھا ہے!''

مجھ سے ہنسی ضبط نہ ہو سکی اور میں اس کی اس سادگی پر دیر تک ہنستا رہا اور وہ کھڑا بور ہوتا رہا۔

چھٹیاں ختم ہو گئیں اور ہم ہوسٹل چلے آئے۔ اجیت کھویا کھویا سا رہنے لگا۔ لیکن اپنے دل کی کیفیت مجھ سے کہتا رہا۔ میں نے سوچا کچھ دنوں میں بہل جائے گا۔ یہ پیار کا روگ ہوتا ہی کچھ ایسا ہے، اچھے اچھوں کو اس نے نکما کر دیا ہے۔

دسمبر میں کالج کے فنکشنز کا دور شروع ہوا۔ پہلے فائن آرٹس سوسائٹی کی طرف

سے ڈرامہ کا پروگرام تھا پھر ''اردو مجلس'' میں روحوں کا مشاعرہ اور آخیر میں یوتھ فیسٹول۔ پروفیسر شرما نے اجیت کو رومیو اور کلپنا سنہا کو جولیٹ کے رول کے لیے پسند کر لیا تھا۔ پروفیسر حسین بضد تھے کہ اجیت کو میراجی کا بھی رول کرنا ہوگا۔ اجیت نے بیک وقت دونوں رول قبول کر لیے۔ روحوں کے مشاعرہ میں مجھے مجاز بننا پڑا۔ اب رول کے الاٹ منٹ کے بعد ہم کالج میں Majaz & Miraji (M & M) سے مشہور ہو گئے۔ ڈرامہ کے لیے ریہرسل شروع ہو گئی۔ اجیت نے بڑی لگن اور امنگ سے کام کیا۔ جب ڈرامہ اسٹیج ہوا تو اجیت کے فن کو بے حد سراہا گیا۔ اس نے رومیو کے کردار میں زندگی ڈال دی تھی۔ اس کا فن کامیابوں کی ان بلندیوں پر تھا، جہاں پہنچ کر فنکار اسی کردار میں ضم ہو جاتا ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ وہ اسٹیج کا ایک کردار ہے۔ اجیت کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ روحوں کا مشاعرہ اپنی مثال آپ تھا۔ میراجی کی آزاد نظم اور مجاز کی پُر جوش انقلابی نظموں نے سماں باندھ دیا تھا۔ اسٹیج کی دنیا میں یہ روحوں کا مشاعرہ واقعی ایک جدت تھی۔ مشاعرہ کے فوراً بعد ایک قوالی پیش کی گئی، ایم اینڈ ایم کی شام کے نام۔ میں نے اور اجیت نے کافی داد پائی۔ جب یوتھ فیسٹول کی ٹیم دلّی جانے لگی تو مجھے دوگانا، اجیت کو رومیو اور کلپنا سنہا کو جولیت کے لیے منتخب کیا گیا۔ فالک ڈانس کے لیے چھ طلبا اور چھ طالبات پر مشتمل ایک گروپ تیار ہوا۔ جب یہ چھوٹا سا فنکاروں کا کارواں پروفیسر شرما اور پروفیسر ویاس کی رہنمائی میں روانہ ہوا تو جنوری کی سرد سرد صبحیں شروع ہو چکی تھیں۔ سفر بہت ہی خوشگوار رہا۔

دلّی یوتھ فیسٹول میں ہم سب نے بہت سارے انعامات حاصل کیے۔ اجیت نے فیسٹول سے واپس آتے ہی ایک بہت ہی اہم اعلان ان لفظوں میں کیا:

''رومیو کو جولیٹ مل گئی ــــــ!' اور یہ ڈرامہ اجیت کی زندگی میں حقیقت بن گیا۔ اجیت نے کلپنا سے شادی کر لی!

جب ہمارے فائنل امتحانات ختم ہو گئے تو اجیت مجھ سے جدا ہو گیا۔ جدائی کی

شام کافی سوگوار تھی۔ میں نے اجیت کو بہت سمجھایا، مگر وہ شدتِ جذبات میں روتا رہا۔ میرے آنسو بھی تھم نہ سکے۔

ہمارے ریزلٹ نکلے تو ہم دونوں کامیاب تھے۔ اجیت نے کلکتہ یونیورسٹی میں کیمسٹری کے پوسٹ گریجویٹ میں داخلہ لیا اور میں نے بی ایچ او میں جیولاجی میں۔ ہم دونوں نے ماسٹر ڈگریاں ایک ہی سال حاصل کیں۔ اجیت اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ چلا گیا اور میری تقرری جیولاجیکل سروے آف انڈیا میں ہوگئی۔ اجیت کا کوئی خط میرے پاس اس درمیان نہ آیا۔ وقت بہتا گیا!

اور آج پورے دس برسوں بعد اجیت میرے ساتھ تھا۔ وہی کالج کا اوباش، بے فکر اور ہنس مکھ سا نوجوان!

یہ ساری باتیں میرے ذہن میں بجلی کی سی سرعت سے کوند گئیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوا یہ کل کی باتیں ہیں۔ اجیت اب بھی ویسا ہی تروتازہ تھا، ویسا ہی شگفتہ ——!!

جب بمبے میل کھڑک پور جنکشن پر رکا تب اجیت نے اپنی پلکیں بند کیں اور مجھے اپنے ساتھ کھڑک پور ہی ڈراپ کرنے کی ضد کی۔ میں لاکھ امرجنسی بتاتا رہا مگر اس نے میری ایک بھی نہ سنی۔ مجبوراً مجھے یہ ٹرین چھوڑ دینا پڑی۔

اجیت نے ٹیکسی ہائر کی اور ہم دونوں روانہ ہوگئے۔ اجیت کہنے لگا ——

''ڈیڈی نے ریٹائر ہو کر یہیں ایک بنگلہ بنوایا ہے۔ جب میں امریکہ سے واپس ہوا تو یہ جگہ مجھے بہت پسند آئی۔ میں نے اپنی لیباریٹری بھی یہیں بنوائی ہے۔ تم ہی اسے نہ دیکھو گے تو میرا کام ادھورا ہی رہ جائے گا۔''

ٹیکسی چلتی رہی اور شہر سے کافی دور ایک آباد سے علاقہ میں رکی۔ اجیت کے ساتھ میں بھی اتر پڑا۔ سڑک کے پاس کافی چہل پہل تھی۔ دوطرفہ دوکانیں بہت سلیقے سے سجی ہوئی تھیں۔ اجیت نے بتایا یہ جگہ آئی آئی ٹی کی وجہ سے اتنی پرکشش ہوگئی ہے۔ آئی آئی ٹی کی عمارتیں دور ہی سے نظر آنے لگی تھیں۔ واقعی جگہ بہت ہی خوبصورت تھی۔

شام کا دھندلکا گہرا ہوتا جا رہا تھا اور فضا میں قدرے نمی سموگئی تھی۔ تھوڑی دور چل کر ہم ایک بنگلہ کے احاطہ میں پہنچ گئے۔ بے حد آراستہ کوٹھی تھی۔ سول انجینئرنگ کا بہترین شاہکار۔ اجیت کا بلند ذوق کوٹھی کے گردوپیش سے عیاں تھا۔ گیٹ کے اندر ہری ہری گھاس سے گھری ہوئی حسین پھولوں کی کیاریاں بہت بھلی معلوم ہو رہی تھیں۔ بیچ میں بنے پختہ حوض میں چھوٹا سا فوارہ ابل رہا تھا۔ مگر کوٹھی بالکل سنسان تھی۔ پورٹیکو سے ہوکر جب میں برآمدہ میں داخل ہوا تو مجھے احساس ہوا جیسے کوٹھی مدتوں سے ویران ہو۔ ہر طرف مکڑوں نے اپنے جال بن رکھے تھے۔ فرش پر جابجا گرد جمی ہوئی تھی۔ دیوار پر چڑھا ہوا روغن دھندلا سا ہو چلا تھا۔ میں ماحول کا بغور جائزہ لیتا رہا۔ اجیت نے پیچھے کے ایک روم کو کھول کر مجھے پکارا۔ جب میں اندر داخل ہوا تو سارا روم دھواں ہی دھواں تھا۔ بڑی بڑی میزوں پر بہت سارے اپریٹس، شیشیاں، اسٹو اور ادویات بے ترتیبی سے بکھرے پڑے تھے۔ ساری کی ساری چیزیں دھندلی نظر آ رہی تھیں۔ اجیت ہی سمجھاتا رہا۔ اس نے بتایا کہ امریکہ میں اس نے می چی گن یونیورسٹی میں ایک ریسرچ کا سبجیکٹ رجسٹرڈ کرالیا ہے اور وہ اپنی اس نجی لیباریٹری میں کچھ تجربات کر کے پھر چند برسوں کے لیے امریکہ چلا جائے گا۔ وہ ایک ایک نکتہ مجھے باریکی سے سمجھاتا رہا۔ جب اس نے ایک بڑے سے فلاسک میں رکھے ہوئے رنگین سے محلول کو اپنے ہاتھوں میں اٹھایا تو ایک بہت ہی تیز سی چمک ہوئی اور زوروں کے دھماکے کے ساتھ فلاسک پاش پاش ہو گیا۔ اس میں رکھا ہوا تمام کا تمام محلول اجیت پر بری طرح پڑ چکا تھا۔ میرے دیکھتے دیکھتے اجیت کا جسم موم کی طرح پگھلنے لگا اور پھر بالکل نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اور پورے کمرے میں دھواں دھواں اسی طرح پھیل گیا کہ کچھ بھی نظر نہ آتا تھا۔ یہ سب کچھ اتنی سرعت سے ہوا کہ میں کچھ سمجھ نہ سکا۔ میرا دماغ ماؤف ہو گیا اور میں کمرے کی چوکھٹ پر بری طرح گر کر بے ہوش ہو گیا۔

....

جب میری آنکھیں کھلیں تو میں ہسپتال میں پڑا تھا۔ ڈاکٹر میرے بیڈ کے پاس ہی تھا۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے ماحول کو گھور رہا تھا۔ سارے چہرے اجنبی تھے۔ ماحول میرے لیے بالکل نیا تھا۔

ڈاکٹر نے میری نبض تھامے تھامے کہا —— ''ڈونٹ وری، آپ ہسپتال میں بالکل محفوظ ہیں ——!!''

''اجیت محفوظ ہے یا نہیں ڈاکٹر ——؟ مجھے اجیت سے ملایئے پلیز ——!!'' میں نے بیڈ سے تقریباً اٹھتے ہوئے کہا ''ابھی آپ کو مکمل آرام کی ضرورت ہے۔ اجیت کے لیے فکرمند نہ ہوں۔'' ڈاکٹر نے مجھے بیڈ پر لٹاتے ہوئے کہا۔

دوپہر تک میری طبیعت بالکل ٹھیک ہوگئی۔ مگر اجیت سے ملاقات نہ ہوئی۔ میں نے ڈاکٹر سے بار بار پوچھا مگر وہ ہمیں تسلیاں دیتا رہا۔ میرے دل میں کھٹکا پیدا ہوتا رہا۔ تقریباً ڈھائی بجے ڈاکٹر مسکراتے ہوئے میرے قریب آ کر بیٹھ گئے اور بولے ''ہیلو ——! آپ کیسے ہیں؟''

''میں تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں ڈاکٹر —— مگر اجیت کہاں ہے؟ خدارا جلدی بتایئے گا ——!''

''مسٹر عظیم ——! شاید آپ کو علم نہیں کہ اجیت آج سے چار سال پہلے ہی اس کوٹھی میں بنی اپنی اس لیبارٹری میں کسی ضروری ریسرچ کرتے ہوئے ہلاک ہوگیا ہے اور آپ جیسے اس کے کتنے دوست اس کی بھٹکتی ہوئی روح کے فریب میں آ کر اس کوٹھی میں بے ہوش پائے گئے ہیں۔ یہ اسپتال قریب ہے، اس لیے شام کے وقت جب بھی دھماکے کی جگر خراش آواز اس کوٹھی سے بلند ہوتی ہے ہم وہاں پہنچ جاتے ہیں اور کسی نہ کسی کو بے ہوشی کے عالم میں پاتے ہیں۔ اجیت کی موت ٹھیک شام کے وقت ہوئی تھی، جس وقت اب بھی یہ دھماکے سننے میں آتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے کسی کو خبر نہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کو یہ منحوس خبر میں سنا رہا ہوں مگر موت نے کس کو چھوڑا ہے ——!؟''

میں غم کے اتھاہ سمندر میں غوطے لگاتا رہا۔ اجیت کل تک میرے ساتھ تھا۔ میں کیسے یقین کر لیتا کہ وہ اب زندہ نہیں۔ وہ تو زندہ ہے، میری طرح —— آپ کی طرح ——! ڈاکٹر پاگل ہو گیا ہے۔ اگر اجیت کو موت آ گئی ہوگی تو موت کو موت کیوں نہ آ جاتی۔ میرا دل ہرگز نہیں مانتا کہ میرا دوست، میرا بھائی، اس دنیا میں اب نہیں ہے۔ وہ تو امر ہے۔ ہوا کی راگنی، موسم کی جاذبیت، چاند کی چاندنی اس کے پیار کی محتاج ہے۔ میں ہرگز ہرگز نہیں مانوں گا کہ اجیت زندہ نہیں! مجھ سے نہ کہو کہ وہ مر گیا۔ ورنہ میں اپنا سر در و دیوار سے دیوانہ وار ٹکرا ٹکرا کر چور چور کر لوں گا!

....

مجھ پر غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ سارا ماحول مجھے ماتمی معلوم ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر کافی دیر تک مجھے بہلانے کی کوششیں کرتا رہا۔ مگر میرے دل کو نہ بہلنا تھا نہ وہ بہلا۔ شام کا اخبار میں سرسری طور پر پڑھ رہا تھا کہ ایک سرخی پر نظر جم گئی۔

"روڑکیلا فرقہ وارانہ فساد کی زہریلی آگ کی زد میں۔ سارے شہر میں کرفیو نافذ۔ کل بمبے میل پر شرپسندوں کا حملہ۔ مسافروں کو بلا امتیازِ قوم و ملت بری طرح لوٹا اور قتل کیا گیا۔ فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ سے دو لاشیں برآمد ——"

میرا سر چکرا گیا۔ مسٹر گوندراجن اور وی سی داردکا کے چہرے میری نظروں میں گھوم گئے۔ میری سمجھ میں آیا کہ اجیت نے کیوں مجھے ٹرین سے زبردستی اتارا تھا۔

■❖■

پتھر کی زبان

ایک ہزار فٹ کی بلندی کے پہاڑی راستے کو طے کر کے جب وہ گھاٹ کے دروازے میں داخل ہوا تو پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے چمک رہے تھے۔ اس نے اپنی پھولتی ہوئی سانسوں پر قابو پانے کے لیے ایک بڑے سے پتھر پر پیٹھ ٹکا دی تو رضیہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ اس ہنسی کی ضرب اس نے اپنے دھڑکتے ہوئے دل پر محسوس کی اور تلملا کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ رضیہ پھر بھی ہنستی رہی۔ اس کی ہنسی کا مفہوم بہت ہی عمومی تھا۔ وہ ظفر کی بجھی ہوئی آنکھوں میں تکان کی لہروں، اترے ہوئے چہرے پر پسینے کی لکیروں اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کی بے ربطی پر طنزیہ ہنسی ہنس رہی تھی۔ ظفر نے پیشانی سے پسینے کے قطروں کو اپنے دستی میں جذب کرتے ہوئے بجھی سی آواز میں پوچھا ——— ''کیوں رضیہ! تم اتنی خوش کیوں ہو؟''

رضیہ نے اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے کہا——— ''تمہاری اس جوانمردی پر ہنس رہی ہوں کہ اتنی معمولی سی مسافت پر تم اتنے تھکے اور ہارے ہوئے نظر آ رہے ہو۔''

''اچھ———ا———ا———!!'' کہتے ہوئے ظفر نے اس کی زلفیں اپنے شانوں پر لہرا لیں اور تھوڑی دیر خاموش رہ کر بولا——— ''لو بھئی! اب تو میں بالکل تازہ دم ہو گیا ہوں! اس ذرا سی چھاؤں میں کتنی بڑی راحت ہے!''

رضیہ کے صبیح عارض شفق گوں ہو گئے۔

اور پھر رضیہ کے گالوں پر گلال گھلتے رہے اور شفق پھوٹتی رہی۔ ظفر دیر تک سفیدی اور سرخی کی اس آنکھ مچولی کو دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا اور ڈوب جانے لگا۔ پاس ہی پیپل کے درخت پر ایک پرندہ پھڑ پھڑایا اور پہاڑ کی کھائی کی طرف تیر گیا۔ ظفر اور رضیہ اسے دیر تک فضا میں پرواز کرتے ہوئے دیکھتے رہے۔ پرندہ منڈلاتا رہا اور پھر پہاڑ کے درے میں کہیں گم ہو گیا۔ گھاٹ کی سیڑھیوں کے سلسلے کے بعد چٹانوں سے گزر کر وہ دونوں بیس فٹ کی بلندی پر بنے برج میں داخل ہوئے جہاں سے دور دور تک کی چیزیں بالکل صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کنارے پر بہت دلفریب ہوا چل رہی تھی۔ وہ بہت دیر تک آسمان کے مشرقی کنارے پر ابھرتے ہوئے سورج کو دیکھتے رہے۔ سون ندی کے دونوں کناروں کے بیچ بہتے ہوئے دھاروں کی لکیروں سے سورج کی کرنیں الجھ رہی تھیں۔ پہاڑ کے نیچے کی بستیاں، ہرے بھرے کھیت، پہاڑی ندی پر ریلوے پل، مرلی پہاڑی کے دامن میں کلیان پور کی سیمنٹ فیکٹری، چمنیوں سے ابلتے دھواں، سون ندی کے بستر پر بکھرے ہوئے سفید سفید سے ذرات اور لہروں کا کھیل کسی چابکدست فنکار کی بنائی ہوئی شاہکار تصویر کی طرح معلوم ہو رہے تھے۔ رضیہ ان نظاروں میں گم تھی۔ اس کے لیے ایسے نظارے واقعی انوکھے تھے۔ لیکن ظفر انھیں اپنے بچپن سے ہی دیکھتا آرہا تھا۔ نہ جانے کتنی بار اپنے دوستوں کے ساتھ اس کی سیر کی تھی، لیکن اس بار اُسے ایک عجیب سی، نا قابلِ بیان سی خوشی کا احساس ہو رہا تھا، جو اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ یہ سب کچھ شاید رضیہ کی موجودگی کی وجہ سے تھا۔ رضیہ کتنی حسین تھی! صندلیں بانہیں، مخمور آنکھیں، ہونٹوں سے رس ٹپکتا ہوا، آنکھوں میں ستارے جھلملاتے ہوئے، وہ سراپا بہار، مجسم شعر و نغمہ تھی!

وہ رضیہ کو ساری چیزیں دکھاتا رہا۔ نیچے پھیلی ہوئی بستی میں کچے اور پختہ

مکانات، مسجد کے مینار، مدرسہ کی عمارت، بازار، سڑکوں پر گزرتی ہوئی گاڑیاں، مقبرہ اور عیدگاہ گھروندوں جیسے معلوم ہورہے تھے۔ وہ دیر تک ان گھروندوں میں اپنے مکان کو تلاش کرتے رہے۔ تھوڑی ہی دیر میں ظفر کا نوکر کھانے کا سامان لے کر ہانپتا ہوا اوپر آیا۔ دھیرے دھیرے لوگوں کی بھیڑ بڑھنے لگی۔ ہوا میں لطیف سی ٹھنڈک ہوگئی اور پھر ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی اور بتدریج بڑھتی گئی۔ برج میں اور لوگ آگئے اور اب تنہائی کا احساس ختم سا ہوگیا۔ بارش کا سنگیت جنگل میں پھیلنے لگا اور فضا گنگناتی سی محسوس ہوئی۔ اس گنگناتی سی فضاؤں کے سینے میں تاریخ کے پچھلے ہوئے افسانے، ماضی کی دلفریب داستان اور عہدِ مغلیہ کی دلفریبی کا ایک باب سمایا ہوا تھا۔ دور مندر کا عکس راجا ہریش چندر کی صداقت کی طرح باوقار اور اس کے کردار کی طرح آب دار، بارش سے بھیگ کر اور پُرنور ہوگیا تھا۔ کہتے ہیں یہ مندر راجا ہریش چندر نے اپنے بیٹے روہت کے جنم پر بنوایا تھا اور ایک بڑا ہی یادگار یگ بھی کیا تھا، جس کی نسبت سے اس کا نام بھی روہتاس پڑا تھا۔ بارش کچھ کم ہونے لگی تو لوگ وہاں سے روانہ ہوئے۔ ظفر اور رضیہ بھی چل پڑے۔ بارش نے بہت ہی خوشگوار سی خنکی فضا کو بخش دی تھی۔ رضیہ ابھی تک تازہ دم تھی۔ ظفر نے اسے چھیڑا

"اس قلعہ میں لوگوں کی بھیڑ رہتی ہے۔ پیار و محبت میں ذرا——"

"بس بس! آپ کو تو بس یہی سب کچھ رہتا ہے۔ میں نے کوئی چوری تھوڑے ہی کی ہے!"

رضیہ کے ابرو تن گئے۔

"میرا مطلب ہے ذرا لوگوں کا خیال——" ظفر بولتا رہا۔

"اچھا اچھا—— خیال! آخر کیا خیال؟"

"وہ دیکھو کتنے سارے لوگ ہیں۔" ظفر نے لوگوں کی طرف اشارہ کیا۔

''خیال تو آپ کو کرنا ہے اور پھر یہ لوگ تو خود دوسروں کا خیال نہیں کرتے۔''

''اچھا بابا ـــــ میں اپنی بات واپس لیتا ہوں۔''

راستہ طے ہوتا رہا۔ یہاں سے قلعے کا فاصلہ دو میل ہے اور عموماً یوں ہی باتیں کرتے کٹ جایا کرتا ہے۔ قلعہ کے صدر دروازہ کا مینار دکھائی دینے لگا تھا۔ وہ لوگ ''نکٹا'' سے گزر رہے تھے۔ یہ چند شکستہ دیواروں کا ایک سلسلہ جس سے قدیم آبادی کا ثبوت ملتا ہے۔ یہاں زور سے بولنے سے بازگشت ہوتی ہے اور سارا جنگل بولتا سا محسوس ہوتا ہے۔ چند شریر بچوں نے زور سے پوچھا ـــــ

''ارے نکٹا ـــــ''

''کیا ـــــ ؟''

''تیرے کئے جورو ـــــ ؟''

''دو ـــــ''

''ایک دے دے ـــــ''

''لے لے ـــــ''

بچوں اور عورتوں کی دبی دبی ہنسی جنگل سے ابھری اور ڈوب گئی۔ ایک عجیب الف لیلوی منظر ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا اب کسی چٹان سے دروازہ کھلے گا اور ایک دیو حاضر ہو کر کہے گا ـــــ ''میں نکٹا ہوں، میرے آقا! حکم دیجیے ـــــ''

قلعہ کی بلند عمارت اب صاف نظر آ رہی تھی۔ ظفر بڑی لگن سے رضیہ کو تمام چیزیں دکھاتا رہا۔ ظفر نے پوچھا

''تم نے پہلے تو کبھی یہ قلعہ نہیں دیکھا تھا؟''

رضیہ تھوڑے توقف کے بعد بالکل ہی دھیمی آواز میں بولی:

''چار سال پہلے پاپا کے ساتھ آئی تھی۔ وہ اُن دنوں گیا میں پوسٹڈ تھے۔''

''اچھا——! میں سمجھ رہا تھا تم پہلی بار آرہی ہو۔ خیر پاپا کے ساتھ اتنی سیر بھی تو نہ کی ہوگی۔''

''نہیں! خوب سیر کی تھی۔ اُن دنوں ماموں ابا اور اُن کے لڑکے حیات دلّی سے آئے ہوئے تھے۔ حیات بھائی ہی نے یہاں کا پروگرام بنایا تھا۔ وہ دو ماہ کی چھٹی پر شکاگو سے آئے تھے۔''

''اچھا—— وہ شکاگو میں کیا کرتے ہیں؟'' ظفر نے کریدا۔

''وہ وہاں کسی فرم میں انجینئر ہیں اور بڑے آرام سے ہیں۔ زندگی کا صحیح لطف تو ایسے ہی ملکوں میں ہے۔''

''کیا وہ ہر سال ہندوستان آتے ہیں؟''

''ہاں! ہر سال دو ماہ کے لیے آتے ہیں۔''

''حیات صاحب کیا اکلوتے ہیں؟''

''جی—— اکلوتے ہی ہیں۔ بڑے ذہین، خوبرو اور اسمارٹ! اُس بار قلعہ کی سیر میں تو بس لطف ہی آگیا تھا۔ ان گنت تصویریں انھوں نے مووی کیمرے سے لی تھیں۔ بہت سارے گانے ٹیپ کیے تھے اور قلعہ کے آس پاس کی بستیوں سے آنے والے آدی باسی مرد عورتیں اور بچوں کی باتیں ٹیپ کی تھیں۔ کہتے تھے امریکہ جا کر اس کمپنی کو یاد کریں گے۔'' کہتے کہتے رضیہ خاموش ہوگئی۔ اس کی خاموشی میں ایک داستان سمٹی ہوئی تھی۔ ظفر کی انا کو ٹھیس پہنچی اور رضیہ سے حیات کی تعریفیں سن کر اس کی بھنویں تن سی گئیں۔ ظفر نے ماحول کو بوجھل ہونے سے بچاتے ہوئے بات کا رخ دوسری طرف موڑ دیا۔

''لیجیے صاحب! اب ہماری سواری قلعہ میں داخل ہوتی ہے!''

قلعہ کے احاطہ میں داخل ہوتے ہی ہوا کا ایک خوشگوار جھونکا آیا اور ساری تکان دور ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ احاطہ کا ہرا بھرا میدان اور میدان کے بائیں جانب قلعہ کی پُروقار عمارتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ محرابیں، طاق، برجیاں، چبوترے اور سائبانوں میں فنِ تعمیر کے اعلیٰ جوہر نمایاں تھے۔ پتھر کی دیواروں پر نقش و نگار اس عہد کی کہانیاں سناتے محسوس ہوتے تھے، جس عہد میں آسودگی تھی، راحت تھی، بے فکری زندگی تھی۔ آہستہ آہستہ لوگوں کا ریلا بڑھتا گیا اور قلعہ کی پُرسکون فضا میں ہنگامے بس گئے۔ ہرے بھرے جنگل کے دامن میں کھڑا یہ قلعہ بے حد پُررونق ہوتا جا رہا تھا۔ قلعہ کی عمارتوں میں عموماً لوگ 'بارہ دری' ہی کو رات بسر کرنے کے لیے منتخب کرتے ہیں۔ اس کی مستحکم پتھر کی عمارت فنِ تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ بڑے بڑے ستون، چھتیں اور فرش تراشیدہ پتھر سے بنے ہوئے ہیں۔ اس کی کھلی چھت پر مرکزی چبوترہ اور چاروں طرف ایک ایک برج ہیں جن پر ایسا گمان ہوتا ہے، مصاحبین کا کوئی اجتماع ہے اور کوئی اہم موضوع زیرِ بحث ہے۔ ساری فضا پراسرار معلوم ہوتی ہے۔ دوسری عمارت ''پھول محل'' کہلاتی ہے، جس کی دیواروں پر نقش و نگار ایسے نکھرے ہوئے ہیں جیسے بالکل تازہ ہوں۔ عمارت 'ستون محل' ہے جس کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ اس میں نصف شب کے بعد راگ اور رنگ کی محفلیں اب بھی بجتی ہیں اور دور سے لوگوں نے اس کے سنگیت کو اکثر سنا بھی ہے۔ اکثر رات گئے اس طرف سے گزرنے میں بہت ہی خوف معلوم ہوتا ہے۔ اس کے سامنے کی عمارت تین منزلہ ہے اور سب سے بلند تر یہ 'دل بادل' کے نام سے موسوم ہے۔ تمام کی تمام منزلیں صحیح و سلامت ہیں۔ سب سے آخری منزل پر ایک برج ہے جو ساری عمارتوں میں سب سے بلند ہے۔ وہاں سے قلعہ کی دور دور جگہوں کا بخوبی نظارہ ہو جاتا ہے۔ 'دل

بادل سے متصل عمارت تقریباً پچاس کمروں پر مشتمل ہے۔ چاروں طرف کمرے ہی کمرے ہیں۔ اور درمیان میں باغ کی روش کے نشانات ہیں۔ پھر اس کے پورب جانب دو بڑے بڑے حوض ہیں، جہاں سے پورے قلعہ میں پانی کی سپلائی کا شاید انتظام تھا۔ پھر مشرقی حصہ میں چار ایسے کمرے ہیں جن میں مرکزی روشن دان ہے اور ہر طرف سے روشنی چھن چھن کر کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کمرے راجا مان سنگھ کی عبادت کے کمرے ہیں۔ پھر قلعہ کے جنوبی عقب میں آبشاروں کا سنگیت ہے جس کی ہر آواز میں ایک راگنی ہے۔ آبشاروں کے اُس پار عدالت، بازار اور فوجی عملہ کی آبادی کے نشانات ملتے ہیں۔ اس جگہ آ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ قلعہ کی حکومت کتنی منظم اور پرسکون تھی۔ پھر پہاڑ کا آخری سرا آجاتا ہے، جس پر دفاعی دیوار کا لامتناہی سلسلہ اب تک قائم ہے۔ دیوار سے ملحق توپ خانے اور دفاعی انتظامات کی نشانیاں عہدِ مغلیہ کی یادیں تازہ کرتی ہیں۔ اس طرف جنگلی بستیاں بھی آباد ہیں۔ بیچ بیچ میں کہیں کہیں مزارات اور غیر آباد مساجد کثیر تعداد میں ملتی ہیں۔ جنوبی آخری سرے کے دہانے پر ایک بزرگ حضرت بہاؤالدین شاہؒ کا مزارِ مبارک ہے اور اُس کے بعد ہزار فٹ کی کھائی۔ مزارِ مبارک پتھر کے درار میں ہے جہاں جا کر بہت ہی سکون محسوس ہوتا ہے۔ پہاڑ کا سلسلہ دور دور تک چلا جاتا ہے۔ قلعہ کی آخری حد بندی چودہ میل پر واقع سنگھ دروازہ تک بتائی جاتی ہے۔ قلعہ کے شمالی حصہ میں اب بھی چھوٹی چھوٹی بستیاں ہیں۔ حبش خاں کا مقبرہ اور مسجدیں ہیں۔ حبش خاں اکبرِ اعظم کے سپہ سالار تھے اور اُن کی وفات راجا مان سنگھ کے روہتاس کے قیام کے دوران ہوگئی تھی۔ دور دور تک قلعہ کی آبادی کی نشانیاں ملتی ہیں اور سارا پہاڑ اُس عہد کے افسانے سناتا معلوم ہوتا ہے۔ قدم قدم پر عمارتیں اور نشانیاں ہیں۔ پہاڑی راستوں پر کہیں کہیں سرنگوں جیسے راستے بھی خود بخود نمودار ہوگئے ہیں، جس

سے قیاس ہوتا ہے، جنگ کے زمانے میں استعمال کی جانے والی خفیہ سرنگیں بھی تھیں۔

احساس کی آنکھیں راجہ مان سنگھ کے زمانے کو بہت قریب سے دیکھنے لگی تھیں۔ سارا قلعہ معمور تھا اور شاہی فرمان لوگوں کو سنایا جا رہا تھا۔ لوگ دست بستہ گردن جھکائے بہت انہماک سے سن رہے تھے۔ دلّی سے قاصد ابھی ابھی ہی آیا تھا۔ راجہ مان سنگھ کو بہار، بنگال اور اڑیسہ کا حکمران بنا کر بھیجا گیا تھا اور اس خطۂ کوہ و بیاباں کو چمن زار بنانے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ اب اس ذرہ کو آفتاب کی چمک بخشی گئی تھی۔ اپنے اس چار پانچ برسوں کی قلیل مدت کے قیام میں راجہ مان سنگھ نے اس خطہ کو اپنا دارالخلافہ بنایا اور اسے ایک تاریخی اہمیت بخش دی۔ بعد میں اُن کے وفادار اور جاں نثار جاگیرداروں نے پہاڑ سے نیچے اتر کر بستیاں آباد کیں۔

ظفر نے رضیہ کو ان سارے مقامات کی سیر کرائی۔ سارے دن کی تکان کے بعد جب دونوں ڈاک بنگلہ لوٹے تو موسم بے حد خوشگوار ہو رہا تھا۔ ڈاک بنگلہ کے سامنے ہرا بھرا باغ اور اس کی تھوڑی ہی دوری پر پہاڑ کے آخری کنارے پر چوڑی دیواروں کا سلسلہ۔ پانی سے بھرے بھورے بھورے بادل پہاڑ کے پتھروں میں الجھتے ڈاک بنگلہ کے کمروں میں سماتے ہوئے محسوس ہوتے تو بدن میں جھرجھری سی سما جاتی۔ آہستہ آہستہ رات کا سیاہ آنچل پھیلنے لگا۔ ڈاک بنگلہ کے دوسرے کمرے میں بھی کچھ لوگ آپہنچے اور جیسے جیسے رات بڑھتی گئی پہاڑوں اور جنگلات کی پرسکون سی فضا طاری ہوتی گئی۔ دور دور سے آبشاروں کا سنگیت سنائی دیتا رہا اور پھر ساری فضا نے آہستہ آہستہ رات کی چادر اوڑھ لی۔

جب صبح نے آنکھیں کھولیں تو منظر بہت ہی سہانا تھا۔ سورج زمین سے نکلتا محسوس ہو رہا تھا اور بادلوں کے ٹکڑوں میں جب کرنیں چبھتی تھیں تو بادلوں کے دل میں

گدگدی سی ہونے لگتی تھی۔ ظفر اور رضیہ ڈاک بنگلہ سے دور تک چہل قدمی کرتے نکل گئے۔ رضیہ بہت بشاش اور شگفتہ تھی۔ اس کے لیے ایسی رت اور ایسی فضا بالکل نئی تھی۔ اسے یہ پہاڑی مقام تمام تر رعنائیوں کے ساتھ بے حد رومان انگیز معلوم ہوا۔

وہ دن واپسی کا تھا۔ رضیہ نے اُس پہاڑی تاریخی مقام کی سیر میں کافی لطف اٹھایا۔ سیاحوں کا سلسلہ کافی طویل ہوتا جارہا تھا۔ جو لوگ کل سے آئے ہوئے تھے وہ واپس جانے کی تیاریاں کررہے تھے۔ واپس ہوتے ہوتے رضیہ نے ظفر سے کہا——

''ایک بار پھر قلعہ کو اُس کے سب سے بلند مقام سے دیکھیں۔ سب سے اونچی برج سے یہ بہت ہی پرشکوہ معلوم ہوتا ہے۔''

''ہاں——ہاں—— کیوں نہیں۔'' کہتے ہوئے ظفر نے قلعہ کا رخ کیا اور دونوں قلعے کے زینے طے کرنے لگے۔ 'دل بادل' کی سب سے بلند برج پر پہنچتے پہنچتے رضیہ کی سانسیں پھولنے لگیں۔ جب وہ اوپر پہنچ گئے تو بارش پھر شروع ہوگئی۔ دور سبزہ زاروں پر روئی کے گالے جیسے بادل منڈلاتے رہے۔ برج کی دیواروں پر بے شمار لوگوں کے نام کھدے ہوئے تھے۔ یادگار کے طور پر لوگوں نے لکھ چھوڑا تھا۔ رضیہ کو یاد آیا اس بار اُس نے اپنا نام بھی کہیں لکھ چھوڑا تھا۔ دھندلی سی تحریر چمکی اور رضیہ اس دیوار کے قریب تھی۔ دیوار کی طرف پیٹھ کر کے وہ ظفر کی طرف مخاطب ہوئی۔

''چلئے اب واپس چلیں——'' ظفر اپنا نام لکھنے میں منہمک تھا۔ ادھر رضیہ نروس ہوتی رہی۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے چند قطرے بھر چمکنے لگے اور پیٹھ کی جانب چھپکلی سی رینگتی محسوس ہوتی رہی۔ پتھر کی دیواروں سے آوازیں جیسی آتی محسوس ہوتی رہیں۔ رضیہ پر سکتہ سا طاری ہوتا چلا گیا۔

ظفر اپنا نام لکھ کر بہت اطمینان سے رضیہ کے قریب آیا اور اُسے رنگین پنسل

دیتے ہوئے بولا —— ’’لو بھئی —— تم اپنا بھی اپنا اس دیوار پر لکھ دو۔ کہتے ہیں اس بلند مقام پر نام لکھنے والوں کو سر بلندیاں حاصل ہوتی ہیں۔‘‘

رضیہ خاموشی سے خالی خالی نگاہوں سے ظفر کی طرف دیکھتی رہی۔ ظفر کی نگاہ یکا یک سامنے کی دیوار پر پڑی۔ جس پر رضیہ کا نام نقش تھا۔ رضیہ دیوار میں سٹی رہی۔ پیٹھ کی طرف رضیہ کا نام صاف نظر آتا رہا اور پھر اُس کے بعد کوئی ادھورا سا نام بھی جھانک رہا تھا، لیکن رضیہ دیوار سے چپکی رہی۔ ظفر معاملہ کی نزاکت کو سمجھ گیا اور فوراً دوسری طرف مڑ کر اس نے خود ہی اپنے نام سے پہلے رضیہ کا نام لکھ دیا اور کہا —— ’’پگلی! نام میں کیا ہوتا ہے اور پھر ادھار لیا ہوا نام —— ‘‘ رضیہ نیچی نگاہیں کیے زمین کی طرف دیکھتی رہی۔

وہ واپس چلے تو ماحول بہت ہی بوجھل بوجھل سا ہو گیا تھا لیکن ظفر بہت ہی بشاش تھا!!

■❖■

نیا آدمی

ارچنا اپنے نئے پڑوسی کو دیکھ کر حیرت میں رہ گئی۔

وہ اس کا دیرینہ محبوب گوتم تھا۔ وہی چھریرا بدن، کتابی چہرہ، گندمی رنگت اور ذہین آنکھیں۔ اُسے دیکھتے ہی ارچنا کا دل دھک دھک کرنے لگا اور اس کے ہاتھ سے گلاس گر کر چکنا چور ہو گیا۔ فرش پر شیشے کی ساری کرچیاں بکھر گئیں۔ گوتم سامنے والے مکان کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا اور ارچنا اپنی بالکنی سے اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس پر ایک لرزہ طاری تھا۔ وہ بالکنی میں دھیرے دھیرے ٹہلتی ہوئی اپنی حالت پر قابو پانے کی کوششیں کرتی رہی۔

آہستہ آہستہ اجالے کو اندھیرا نگلتا جارہا تھا اور آسمان کی صاف وشفاف چادر پر کالک کے دھبے جیسا لگتا جارہا تھا۔ ارچنا اپنے آپ میں پیچ وتاپ سی کھاتی رہی۔ وہ گوتم کو دس برسوں کے بعد دیکھ رہی تھی! اس کے ذہن کے تالاب کی پرسکون سطح پر گوتم کی آمد کی کنکری نے ہچکولے پیدا کر دیے تھے جو اس کی ننھی سی جان کے لیے باعثِ پریشانی تھا۔ اسے کالج کے سارے البیلے دن یاد آتے رہے۔

ابھی کالج میں وہ نئی نئی تھی۔ اس کی سہیلیوں میں گوتم کا نام بہت محبت سے لیا جاتا تھا۔ رادھا، انوپما، رضیہ اور سنگیتا سے گوتم کی تعریفیں سن سن اس کا بھی دل چاہا کہ اس سے کبھی باتیں کرے۔ لیکن اس نے اپنے دل کی اس خواہش کا اظہار کسی سہیلی سے نہ کیا۔ نہ جانے کیوں گوتم کی باتیں کھلے عام کرنے میں اسے اکتاہٹ سی ہوتی رہتی، لیکن دل

کے اندر ایک کھلبلی سی ضروری ہوتی رہتی۔ اُس ابھرتی ہوئی خواہش کی تکمیل کے لیے اس نے نئی راہیں نکالیں۔ وہ لائبریری میں اسے اکثر تلاش کرتی رہتی۔ اس نے سنا تھا کہ گوتم وقفوں میں صرف لائبریری ہی میں وقت گزارتا ہے۔ کئی دنوں کی کوششوں کے بعد ایک دن وہ ایک گوشہ میں کتابوں کی دنیا میں غرق نظر آیا۔ وہ اس کے پاس کتابیں ڈھونڈنے کہ بہانے پہنچ گئی، لیکن گوتم نے کوئی نوٹس نہ لیا۔ ارچنا اس کے پاس ہی کھڑی اسے پلکیں جھپکائے بغیر دیکھتی رہی۔ جب گوتم نے اس کی طرف دیکھا تو ارچنا مسکرائی۔ گوتم نے کوئی بات محسوس نہ کی۔ لیکن جب ارچنا اس کے قریب آتی گئی تو گوتم نے یکا یک پوچھ لیا ـــــ ''کون سی کتاب چاہیے آپ کو؟''

"Come my Beloved"۔ ارچنا بوکھلاہٹ میں کہہ گئی۔

''جی ـــــ!؟''

''جی ہاں! یہی تو نام ہے اس ناول کا جسے میں ڈھونڈ رہی ہوں۔''

''آپ کتابیں بہت پڑھتی ہیں؟''

''کتابیں پڑھتی ہوں لیکن بہت نہیں۔''

''کتابیں پڑھنا ایک اچھی ہابی ہے۔''

''آپ کی اچھائی اپنانے کی کوشش کروں گی۔''

گوتم پہلی بار مسکرایا اور یہ ملاقات معمول بن گئی۔

گوتم ارچنا کے رگِ جان سے بھی قریب تر ہوگیا اور دو دلوں کی زبان ایک ہوگئی۔ آسمان پر جھلملاتے روشن ستارے انھیں زندگی کی تاریک راہوں میں روشنیاں بکھیرنے لگے اور ہر صبح کی لالی ارچنا کی مانگ کا مقدر بننے پر آمادہ ہوگئی۔ ہر شام کا مخملی اندھیرا گوتم کے محبتوں کے جگنو سمیٹے ارمانوں کی شہنائیاں بجایا کرتا اور ایسے میں دونوں ایک دوسرے میں سما جانا چاہتے ـــــ ارچنا نے اس حسین وادی میں اپنی زندگی کی شام کردینے کے خواب دیکھے۔ خیالوں میں اس کی اپنی دنیا بجی۔ گھر گرہستی کا حسین کارواں

سجا اور ننھے منھے پروان چڑھے۔ انھیں ستاروں کی چھاؤں میں اس کا سارا وجود ایک لطیف سی لذت محسوس کرتے کرتے سونے لگتی اور پھر زندگی کی سب سے بڑی نعمت تسکین اسے نصیب ہونے لگتی۔ لیکن کبھی کبھی اس کے دل میں ایک وسوسہ پیدا ہوتا کہ شاید گوتم کسی اور کو اپنا لے۔ یہ ایسا منحوس خیال تھا جس کے ذہن میں آتے ہی اس کی روح تڑپ اٹھتی۔

ایک رات——

گوتم کے خیالوں کو اپنے دماغ کے چمن زار میں پھول کی خوشبو کی طرح سمیٹے وہ بہت آرام سے سوئی رہی، کھوئی رہی۔ صبح کی لالی آسمان کے مشرقی کناروں پر گھلنے لگی تھی کہ کسی نے دروازے پر دستک دی وہ سمجھی گوتم اسے ڈولی میں بٹھا کر اپنے دل کی رانی بنا کر لے جانے کے لیے تو نہیں آیا۔ وہ لجاتی شرماتی ہوئی بڑھی اور دھڑکتے دل سے دروازہ کھولا۔ ایک ننھا فرشتہ ہاتھوں میں تیر کمان تانے اس کی طرف نشانہ بنائے کھڑا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر سہم گئی۔ ننھے خوب صورت کیوپڈ نے بہت تیزی سے تیر چھوڑ دیا اور وہ سیدھا اس کے دل میں پیوست ہوگیا۔ یہ اس کے جگر سے پار ہو کر شن سے گزر گیا۔ وہ دیکھتی رہ گئی۔ اور تیر کی نوک پر اس کا دل اٹکا ہوا سات سمندروں پار جا گرا۔

اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ رات کے اندھیرے میں اسے خواب کے اِس منظر سے بہت ڈر معلوم ہوا۔ اس کے آس پاس کہیں کوئی بھی تو نہ تھا۔ وہ بہت دیر تک جاگتی کروٹیں بدلتی رہی۔

کالج گرمیوں کے لیے بند ہوگیا اور ارچنا اپنے پاپا، ممی اور چھوٹے راجو کے ساتھ گرمیاں گزارنے کشمیر چلی گئی۔ کشمیر کی وادی میں موسمِ گل تھا۔ ہری بھری وادیوں میں قدرت کی صناعی دیکھتی رہی۔ ڈل جھیل کے صاف و شفاف پانی میں زندگی کی لہریں ملیں، نشاط باغ میں کیف و نشاط کے پھولوں کا انبار اور امرناتھ کی گپھا میں امن و شانتی کا پیامبر ملا۔ جھیل کے شفاف پانیوں پر جب شکارہ آہستہ آہستہ سبک خرامی کرتا تو وہ ایسا

محسوس کرتی ساری وشائیں اس کی ہمسفر ہیں۔ اور چاند تارے اس کی رہ نمائی کر رہے ہوں۔

ایک صبح وہ یونہی ٹہلی ہوئی کچھ دور نکل گئی۔ پہاڑی ڈھلوان سے سرکتے ہوئے اور پھر بلندیوں پر دوڑ کر چڑھتے، بھیڑوں کے غول میں گھس کر ننھے میمنوں کو اٹھا کر گود میں دبوچ لینے سے اسے بہت لطف آتا رہا۔ فضاؤں میں رچی بسی مدھر موسیقیت سے اسے بہت ہی کیف مل رہا تھا۔ وہ یوں ہی کھیل میں مگن تھی کہ ایک ڈھلوان پر وہ پھسل گئی۔ اور گرتی چلی گئی۔ قریب تھا کہ وہ کھڈ میں گر جاتی کہ کسی نے اسے ہولے سے تھام لیا۔ اس نے اپنے مہربان کی طرف دیکھا تو وہ ایک خوبرو نوجوان تھا۔ جو اسے اپنی بانہوں میں لیے اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ ارچنا اپنے کو ایک نوجوان کی گرفت میں دیکھ کر پریشان ہوئی۔ وہ نوجوان مسکرایا ــــ ''آپ کو چوٹ تو میں نے نہیں آنے دی ہے۔''

''جی ــــ بہت بہت شکریہ ــــ!!''

''ویسے راستے کو چھوڑ کر چلنے کا انجام شاید یہی ہوتا ہے۔''

وہ خالی نظروں سے اس کے سامنے کھڑی دیکھتی رہی۔

''اور پھر یہ کہ آپ نے دشوار راہوں پر ابھی چلنا بھی تو نہیں سیکھا ہے۔''

وہ پھر بھی خاموش رہی۔

''مجھے انیل کہتے ہیں۔ شکارہ ڈریم لینڈ میں ہوں۔ ویسے آپ کا نام کیا پوچھ ــــ؟''

''جی ــــ میرا نام ارچنا ہے۔ ہم لوگ میرین لینڈ میں ہیں۔''

''بہت خوبصورت نام ہے بہت خوشی ہوئی۔ کبھی میرے ڈریم میں آیئے۔''

''جی ــــ!!؟''

''جی ــــ!''

اور وہ مسکرا کر چلتا بنا۔ ارچنا بہت دیر تک اس کی گفتگو کے جادو میں کھوئی رہی۔

اور واقعی وہ دوسری شام ڈریم لینڈ میں انیل کے ماں باپ سے مل رہی تھی۔ یہ لوگ دہلی سے دو ماہ کے لیے کشمیر آئے تھے۔ انیل نے اسی سال انگریزی ادب میں ایم اے فرسٹ کلاس میں کیا تھا اور وہ بہت جلد انگلینڈ جانے والا تھا۔ وہ امیر ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس لیے اس کی ہر خواہش بہت فراخدلی سے پوری کی جاتی تھی۔ انیل کے گھر کے لوگوں سے ارچنا بہت متاثر ہوئی۔ اسے ان لوگوں کے درمیان اجنبیت کا احساس قطعی نہیں ہوا۔ اب ارچنا کی زیادہ تر شامیں انیل کے ساتھ بسر ہوتیں۔ گوتم کا خیال آتے ہی ارچنا اپنے دل میں چھپے چور پر شرماتی رہتی۔ لیکن نہ جانے کیوں اسے اب انیل کا خیال زیادہ رہنے لگا تھا۔ ممکن تھا اس مادہ پرست دنیا کے اصولوں کے تحت اس نے انیل کی دولت اور اس کے خوش آئند مستقبل کو گوتم کے خلوص پر ترجیح دے دی ہو۔ اور اسی خیالِ بے جانے اسے بے وفائی کے غار کے دہانے پر لا کھڑا کر دیا اور دو مہینوں کے بعد جب یہ لکھنؤ لوٹی تو انیل کا خیال اس کی دل کی دھڑکنیں بن چکا تھا۔

گوتم جب اتنی مدت پر اس سے ملا تو اس نے بھی اُس کے رویہ میں سرد مہری محسوس کی اور اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتا رہا۔ ارچنا اس سے کھنچی کھنچی رہنے لگی اور ایک دون وہ آیا جب اس کی شادی انیل سے ہوگئی۔

وہ شام گوتم کے لیے قیامت تھی، لیکن مجبور انسان ہر غم برداشت کر کے بھی مسکراتا ہوا زندہ رہتا ہے۔ اس نے بھی اس زہر کو پی لیا اور لبوں پر تلخ ہنسی بکھیرتا رہا۔ وہ اندر ہی اندر گنگناتا رہا۔ اس نے اپنی زندگی کا مقصد صرف مطالعہ کرنا بنالیا اور دنیا کے تمام علوم وفنون کی کتابوں کا ذخیرہ اپنے ذہن میں اتارتا رہا۔ ارچنا شادی کے بعد انیل کے ساتھ انگلینڈ چلی گئی۔ گوتم کے لیے ساری باتیں زہر بنتی رہیں۔ اس کی زندگی کا سورج طلوع ہوئے بغیر فضاؤں کے غار میں ڈوب گیا۔

دس برسوں کے بعد جب وہ دہلی واپس ہوئی تو ناگاہ گوتم کو دیکھ کر حیران ہوتی رہی۔ ان دس برسوں کی مدت میں انیل نہایت بلند نگاہ اور قابلِ رشک شوہر ثابت ہوا

تھا۔ ارچنا نے انیل کے مزاج کی شگفتگی اور خیالات کی وسعت دیکھ کر ہی اپنی پچھلی زندگی کی کتاب اس کے سامنے کھول کر رکھ دی تھی۔ اسے گوتم سے ہمدردی سی ہوگئی تھی۔ اس نے گوتم سے ملنے کی بھی خواہش ظاہر کی تھی۔ ارچنا سوچتی رہی کہ گوتم سے انیل کا ملنا کہیں کوئی گل نہ کھلا دے اور پھر اسے اپنی پرسکون زندگی کی صبح وشام میں کوئی گرم سا جھکڑ بھی تو پسند نہ تھا۔ لیکن اس نے گوتم سے ملنے کا طے کیا۔ انیل جب شام کو لوٹا تو اس نے گوتم کے متعلق اسے بتایا۔ تھوڑی ہی دیر میں دونوں گوتم کے ڈرائنگ روم میں تھے۔

''میں آپ کا پڑوسی انیل اور یہ میری دھرم پتنی ارچنا——''

''بہت خوشی ہوئی۔ مجھے پرکاش کہتے ہیں۔ آپ کے شہر میں آج ہی آیا ہوں۔''

''پرکاش——!!'' انیل اور ارچنا ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

''جی ہاں——! پرکاش——!!' پرکاش مہرہ!''

پرکاش بولتا رہا۔ ''میں ایک تھکا ہوا آدمی ہوں۔ کبھی فرصت میں آپ کو تفصیل سے بتاؤں گا۔ پہلے آپ یہ بتایئے ٹھنڈا لیں گے یا گرم——''

''جی——؟ ٹھنڈا——!!''

انیل اور ارچنا ذہنی طور پر الجھے رہے۔ پرکاش ایک سنجیدہ باذوق آدمی تھا۔ اس کے ڈرائنگ روم کی سجاوٹ ہی سے اس کی بلند ذوقی کا اندازہ ہو رہا تھا۔ پہلی ملاقات میں تو انھیں بے حد مایوسی ہوئی۔ لیکن اکثر ملتے رہنے کے باعث پرکاش نے اُن کے دل میں ایک مقام پیدا کرلیا۔ پرکاش نے اپنی زندگی کی کربناکیوں اور مایوسیوں کا بھی اکثر ذکر کیا۔ ارچنا بہت کشمکش میں مبتلا رہی کہ پرکاش بالکل گوتم ہے! لیکن وہ اس طرح اجنبیت کا لبادہ کیوں اوڑھے ہوئے ہے؟ شاید وہ اپنے غم کو اس بناوٹی رنگ میں چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔ ارچنا اندر ہی اندر سلگتی رہی۔

ایک شام جب انیل اور ارچنا پرکاش سے ملے تو وہ بے حد مغموم تھا۔ پرکاش نے بتایا کہ وہ پانچ برسوں تک ملٹری میں سرجنٹ تھا اور چینی حملہ آوروں کا مقابلہ کرتے

ہوئے بری طرح زخمی ہوگیا تھا۔ جب وہ ملٹری ہوسپٹل سے طویل مدت کے بعد نکلا تو اسے بتایا گیا کہ اس کے گھر کے لوگ اسے لینے آئے ہیں۔ جن لوگوں کو اس کے والدین اور بھائی بہنیں بتایا گیا وہ لوگ قطعی اجنبی تھے۔ پرکاش نے اُن لوگوں کے ساتھ جانے سے انکار کردیا۔ وہ لوگ اسے زبردستی پکڑ کر اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ لیکن یہ بھاگ کھڑا ہوا اور سیدھے اپنے گاؤں کا رخ کیا۔ گاؤں بمباری سے تباہ و برباد ہو چکا تھا۔ اس کا اپنا گھر مسمار ہوگیا تھا۔ گاؤں کے کچھ بچے کھچے لوگوں نے بھی اسے پرکاش سمجھ کر نہیں پہچانا۔ وہ پھر ملٹری ہوسپٹل آیا۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ اس کا چہرہ اس قدر مسخ ہوگیا تھا کہ پلاسٹک سرجری کے بعد نئی شکل دی جاسکی۔ اس لیے پرکاش نے اپنی شکل کھو کر پہچان بھی کھودی۔ جہاں جاتا اپنے، پرائے سبھی اس کے لیے بالکل اجنبی ہوجاتے۔ آخر کار دنیا کے اس سلوک سے تنگ آ کر اس نے شہروں شہروں گھوم کر اپنی زندگی کے بچے کھچے دن گزارنے کا تہیہ کیا تھا۔ اس نے ایک نئی شخصیت کے ساتھ نئی زندگی شروع کردی تھی۔

پرکاش کی زندگی بے حد الم انگیز تھی۔ ارچنا بھی ماننے کو تیار نہ تھی کہ وہ گوتم نہیں ہے۔ وہ اس راز کو جاننے کے لیے بے چین تھی۔ ایک دن پرکاش کی غیر موجودگی میں اس کے نوکر ارجن سے اس کے متعلق دریافت کیا۔ ارجن پہلے تو خاموش رہا۔ لیکن ارچنا کے اصرار پر وہ کہنے لگا ـــــ ”بی بی جی ـــــ کیا بتاؤں، میرے صاحب کی داستان بڑی غمناک ہے۔ وہ ایک بار بیمار پڑے اور جب اچھے ہوئے تو اپنے کو پرکاش کہنے لگے اور اپنے تمام لوگوں کو پہچاننے سے بھی انکار کردیا۔ میں ان کے ساتھ اس لیے ہوں کہ اُن کی خیریت اُن کے گھر والوں کو بھیجوں۔ یہ کیسی بیماری ہے بی بی جی! مجھے پتہ نہیں، سنتا ہوں کسی لڑکی نے ان سے بے وفائی کی تھی، جس کے غم میں یہ پاگل ہوگئے۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ اِن کے دماغ کا آپریشن ہوا تھا۔ اور پرکاش مہرہ نام کے ایک فوجی جوان کا دماغ ان کے دماغ سے لگا دیا گیا تھا۔ اس علاج نے ہم سے میرے صاحب کو چھین لیا۔ بی بی

جی! یہ میرے صاحب نہیں رہ گئے۔ جسم اور چہرہ تو اُن کا ضرور ہے۔ لیکن روح اور دماغ اس فوجی کی آ گئی ہے۔

ارجن روتا رہا۔

ارچنا نے بے تابی سے پوچھا—— ''ارجن! تمہارے صاحب کا نام کیا تھا؟''

''بی بی ان کا نام گوتم تھا——!''

اور ارچنا چیخ کر فرش پر گر کر بے ہوش ہو گئی——

■❖■

فیصلہ کا درد

آج اُن کی موت سے مجھ پر لرزہ طاری کیوں ہوگیا ہے؟

مجھ میں بیوگی کا احساس بھی بری طرح جاگ کیوں اٹھا ہے! میرے سارے وجود میں ایک عجیب سی بے کلی کیوں سموگئی ہے۔ میری آنکھوں میں یہ آنسو، یہ بے پناہ غم کے ترجمان، کیوں امڈ پڑے ہیں؟ آخر کیوں ——! کیوں ——!! کیوں ——!!! میں نے یہ کبھی نہیں سمجھا کہ اُن سے میری زندگی وابستہ کردی گئی تھی۔ آخر یہ وابستگی ہوتی کیا ہے ——؟ یہی نا کہ میری زندگی کی تمام تر خوشیاں، غم، دکھ، درد سب کچھ اُن پر ہی انحصار کرتے؟ میں اُن کے غم سے مغموم اور اُن کی خوشی سے مسرور ہوتی، مگر ایسا ہوا ہے کہاں ——؟ میں تو بد نصیبی کی ایسی رات تھی جس کی کبھی صبح نمودار نہ ہوئی۔ ایسی خزاں تھی جو بہار کو ترستی رہی۔ ایسی سہاگن تھی جو پیار کو لرزتی رہی۔ مجھے کسی چاہنے والے کے پیار کی لازوال دولت کبھی نہ ملی۔ کسی ہمراز، کسی ہم خیال، کسی ہم زبان کی قربت کے احساس سے دل میں لرزش کبھی نہ ہوئی۔ میں تو مایوسیوں، ناکامیوں، نامرادیوں کی شہزادی بن کر پیدا ہوئی تھی۔

''دیکھو اشرف میاں! اپنی خیریت چاہتے ہو تو میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔'' ابا میاں اُن پر گرج پڑے تھے۔ ''ورنہ میں کیا کر بیٹھوں گا میں خود نہیں جانتا۔ فریبی، مکار، تمہاری شکل سے مجھے نفرت ہوگئی ہے۔ آج سے تمہارے لیے میرے گھر کے دروازے بالکل بند ہیں! میرا فیصلہ ہے ——'' ابا حضور نے میری قسمت کا جیسے فیصلہ کردیا تھا۔

اُن کے پرملال رخسار پر یہ جملہ ادا کرتے کرتے تمتماہٹ رقص کر گئی تھی۔ اور آواز گلوگیر ہوگئی تھی۔ وہ بمشکل تمام اتنا کہہ سکے اور اپنے کمرۂ خاص کا دروازہ زور سے بند کر دیا تھا۔

اشرف ـــــ نہایت فرمانبردار کی طرح باادب کھڑے سب کچھ بڑے صبر سے سنتے رہے۔ اور پھر آہستہ سے گردن جھکائے باہر نکل گئے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ آخر یہ سب کیا ہو رہا تھا ـــــ کیوں ہو رہا تھا ـــــ!

رات میں ابا میاں کے حضور میں میری طلبی ہوئی۔ میرا دل خوف کے احساس سے دھڑکنے لگا۔ میں نے سوچا ضرور کوئی اہم بات ہوگی، ورنہ ابا حضور تو بہت کم کسی کو طلب کرتے ہیں۔ آیا مجھ سے کوئی بڑی بھول تو نہیں ہوگئی؟ طرح طرح کے خیالات ذہن میں ابھرتے رہے۔ میں ڈرتی ڈرتی سہمی ہوئی اُن کے روبرو جا کر کھڑی ہوگئی۔ ابا حضور نے میری جانب دیکھا اور تخت پر بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ میں خاموشی سے سمٹی سمٹائی بیٹھ گئی۔

''بیٹا ملکہ ـــــ میں آج بہت پریشان ہوں۔ میں تمھیں زندگی کی ہر خوشی دینا چاہتا تھا۔ مگر اشرف سے تمھیں منسلک کر کے میں نے بہت بڑی بھول کی ہے۔ میں نے نواب آصف الدولہ سے اپنی دیرینہ دوستی کا حق ادا کرنا چاہا تھا۔ مگر نہیں جانتا تھا کہ یہ اشرف ولی کے گھر میں شیطان کی حیثیت رکھتا تھا۔ میں نے جو کچھ دیکھا ہے، جو کچھ سنا ہے، وہ باتیں دہرانے کی نہیں۔ اسے اب اپنا ہی کہنا میری سب سے بڑی بے عزتی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اپنے اس خاندانی وقار، عظمت اور جاہ وجلال کی توہین کراؤں۔ میں نے تمھیں اس غرض سے طلب کیا ہے کہ تمہارا فیصلہ جان سکوں۔ تمہارا یہ فیصلہ تمہاری ساری زندگی کا فیصلہ ہوگا۔ خوب سوچ سمجھ کر کل مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کرو۔ اور بس ـــــ خدا حافظ ـــــ!'' اُن کی آنکھیں ڈبڈبا اٹھی تھیں۔

میں بجھا بجھا سا دل لیے واپس چلی آئی اور بڑی الجھنوں میں گرفتار رہی۔ یہ چوبیس گھنٹے کا وقت پہاڑ بن گیا۔ میں سوچتی رہی ـــــ سوچتی رہی۔

ابا حضور کو کمی کس بات کی ہے۔ اللہ کا دیا سب کچھ تو ہے ـــــ دولت، عزت،

جاہ وحشمت، یہ تمام کی تمام ریاست اپنی اولاد، بھائی جان —— میں اور ممتاز —— ہاں! امی جان کی بے وقت موت سے ابا حضور کے حوصلے ضرور پست ہو گئے تھے۔ ان کی موت کا غم اب بھی اُن کے وجود پر طاری رہتا ہے۔ اور پھر بھائی جان کی بے التفاتی نے انھیں وقت سے قبل ناتواں کر دیا ہے۔ بھائی جان کی بدمزاجی اس قدر بڑھی کہ انھوں نے بڑی حویلی کو چھوڑ کر چھوٹی حویلی آباد کر دی۔ اور ابا حضور کی بددعاؤں کے مستحق ہو گئے۔ اتنی بڑی لق و دوق حویلی میں صرف میں اور ممتاز ——!

یوں تو ماماؤں اور ملازموں سے حویلی بھری رہتی مگر وہ رونق کہاں تھی۔ جو امی جان کی زندگی میں تھی۔ بس ابا حضور کی خوشیوں کا مرکز میں اور ممتاز ہی تھی۔ میری غیر موجودگی میں حویلی ویران ہو کر رہ جائے گی۔ بس یہی ایک خیال تھا جس نے مجھے رنجیدہ کر دیا۔ اور ابا حضور کی پریشانیوں کا عالم ذہن میں گھوم گیا۔

اور میرا فیصلہ کیا ——! ابھی مہندی کا رنگ بھی تو ہاتھ سے نہیں چھوٹا ہے۔ سہاگ کی بس ایک ہی رات تو ملی تھی۔ وہ بھی اُن کے انتظار ہی میں تو کٹ گئی تھی۔ میں نے تو —— تمام رات قیامت کا انتظار کیا۔ میرے تمام حسین خواب بکھر گئے تھے۔ ارمانوں کے گلشن میں خزاں آدھمکی تھی۔ صبح ہی تو سارے دن کا پتہ دیتی ہے۔ میں نے تو اسی دم اپنی پھوٹی قسمت ٹھونک لی تھی۔ ابا حضور کی بے عزتی —— ہونہہ —— بھلا مجھ سے کبھی برداشت ہوگی۔ مجھے ایسے اوباش، بدچلن اور آوارہ مزاج ساتھی کی ضرورت نہیں تھی۔ اُن کے ساتھ تو یہ زندگی جہنم زار ہو جائے گی۔ اور دوسرے دن میں نے اپنا فیصلہ سنا دیا —— انھیں کہہ دیں میں اُن کے لیے مر چکی ہوں ——!

میں نے اپنی ساری خوشیاں قربان کر دی تھیں۔ ایک عورت کی سب سے بڑی دولت اس کا سہاگ ہوتی ہے۔ مگر میں نے ابا حضور کے وقار، اُن کی عزت کے لیے اپنے سہاگ کی قربانی دی تھی۔ عورت کی سب سے عظیم قربانی ——!

اس فیصلہ کے دوسرے دن ——

وہ سرِ شام چپکے سے زنان خانہ میں گھس آئے، کسی نے انھیں آتے نہیں دیکھا۔ وہ خاموشی سے میرے کمرے میں ایک تاریک کونے میں کھڑے تھے۔ جب میں اپنے کمرے میں گئی انھوں نے مجھے بری طرح بھینچ لیا۔ میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ انھوں نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیے۔ اور اپنا نام مجھے جلدی سے بتایا۔ یہ میری پہلی ملاقات تھی اور اس انداز سے۔ میں خاموش رہی۔ وہ بری طرح ہانپ رہے تھے۔ اور شراب کا بھبھوکا ان کے منہ سے چھوٹ رہا تھا۔ نفرت سے میں نے اُن کی جانب سے منہ پھیر لیا۔ شراب کی مہک نے میرے اندر ایک کھلبلی برپا کردی——"آپ یہاں سے تشریف لے جائیں تو بہتر ہے——!" بے پناہ خفگی کے عالم میں میں نے اُن سے کہا اور ایک ہلکا سا جھٹکا دیا۔ وہ پلنگ سے بری طرح جاٹکرائے۔ اور لڑکھڑا کر گر پڑے۔ میں کمرے کے باہر چلی گئی۔ نہ جانے کب وہ تاریکیوں میں اٹھ کر باہر چلے گئے۔ اور زندگی بھر کی تاریکیاں میرے لیے چھوڑ گئے۔ میں اپنے آپ میں بری طرح پیچ و تاب کھاتی رہی۔ میرے دل میں اُن کا ایک قدرتی انس جو لمحہ بھر کے لیے پیدا ہوا تھا۔ وہ سورج کی روشنی کی پڑتے ہی پھول کی پنکھڑیوں پر پڑی شبنم کی طرح غائب ہو چکا تھا۔ صرف ایک مندمل سا داغ بچ گیا تھا۔ اور بس——!

وقت بہتا رہا——

ممتاز تین بچوں کی ماں بن گئی۔ وہ اپنے سسرال کبھی نہیں گئی۔ میں ابا حضور کے امور زمینداری میں ان کی معاون رہی۔ میں بے حد مصروف رہتی۔ گھر کی تمام تر ذمہ داریاں میری تھیں۔ مجھے کبھی کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ ہاں کبھی کبھی ایک موہوم سی خواہش دل کے کسی کونے میں سر ضرور ابھارتی۔ جب فصلِ گل جادو جگاتا۔ جب اپریل کی دودھیا چاندنی پھیلتی جب ساون کی متوالی پھوار گرتی۔ اور مست مست بادل آسمان کی وسعتوں میں لہریں مارتا۔ اور جب دسمبر کی یخ بستہ سی رات اپنا سرد آنچل پھیلاتی تو ایک عجیب سی کسک دل میں ہوتی۔ ایک عجیب سی تپش کا احساس ہوتا۔ تب میں محسوس کرتی یہ

زندگی کتنی ویران، کتنی خشک اور کتنی سپاٹ ہے۔ جاڑے کی کتنی راتیں یوں ہی کروٹیں بدلتے بدلتے گزر جاتیں۔ یہ راتیں اتنی پریشان کن کیوں ہوتی ہیں؟ ان راتوں کی سیاہی میں جوان دھڑکنوں کا احساس شاید سمویا رہتا ہے۔ تبھی میں اکثر رات کے سناٹے میں اٹھ اٹھ کر دبے پاؤں ممتاز کے کمرے کی طرف چلی جایا کرتی ہوں، جہاں اکثر دبی دبی غیر واضح سرگوشیاں آتی رہتی ہیں۔ جن کو سن کر میرا رواں رواں تپ جاتا ہے۔ میں پھر اپنے کمرے میں آجاتی ہوں اور اپنی ایسی حرکت پر نادم ہوتی ہوں، مگر کیا کروں ——! یہ میرے دل کی وحشت ہے شاید—— بھلا کوئی اسے کیسے داب سکتا ہے؟

جی چاہتا ہے ابا حضور سے بغاوت کر دوں۔ اُن سے صاف صاف کہہ دوں ''میں اپنے فیصلے میں ترمیم کرنا چاہتی ہوں۔ آخر ایسا بھی فیصلہ کیا جو بدلا نہ جا سکے۔ بڑی بڑی عدالتوں کے فیصلے بدل جاتے ہیں اور پھر میرا قصور ہی آخر کیا ہے؟ بدچلنی تو انھوں نے کی ہے جو آپ کو نہیں بھائی۔ آپ کی عزت وشان کے لیے باعثِ توہین ہوئی۔ مگر سزا مجھے کیوں دے رہے ہیں۔ میری ان سسکتی سی راتوں کے مسرت کے لمحات کیوں چھین لیے گئے ہیں! میری آنکھوں سے چھلکتی ہوئی مستی کے جام کہیں کسی کو بدمست نہ کر بیٹھیں! یہ ناگن سی بل کھاتی سیاہ زلفیں کسی کے شانے پر پریشان نہ ہو جائیں، یہ گلاب کی پنکھڑیاں جیسے یاقوتی ہونٹ کہیں رازِ دل فاش نہ کر دیں۔ یہ مہکتا چاندی کا بدن کسی کی آغوش نہ آباد کر بیٹھے! تب بتایئے—— یہ جوانی آپ کی عزت بڑھائے گی نا؟! میں جذبات میں نہ جانے کیا کیا بہکی بہکی باتیں سوچ بیٹھتی۔ مگر ابا حضور کے سامنے زبان گنگ ہو جاتی۔ اُن کے وقار کا جو سوال تھا——!

ایک منحوس سی شام وہ بھی آئی جس نے ابا حضور کو ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھین لیا۔ ساری حویلی رو پڑی۔

تمام مایوسیوں کی شمعیں روشن ہو گئیں۔ بھائی جان اپنے پورے کنبہ کے ساتھ بڑی حویلی میں پھر منتقل ہو گئے۔ ممتاز نے اپنا الگ مکان بنا لیا اور وہ وہاں آباد ہو گئی۔

میں تن تنہا سارے غم جھیلنے کو جیتی رہی۔ بڑی حویلی کا سارا انتظام جو میرے ہاتھوں میں تھا، اب صرف باورچی خانہ تک محدود ہوگیا۔ باقی تمام کے تمام انتظامات بھائی جان نے خود سنبھال لیے، بھابی کی بے التفاتی دن بدن بڑھتی گئی۔ اور ایک دن وہ بھی آیا جب گڈو، لڈن اور بے بی مجھ سے گھر کی ماما جیسے برتاؤ کرنے لگے۔ اس میں ان بچوں کا کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ تو ماں سے تربیت پاکر ہی ایسا کرتے تھے۔

میرے احساس کو بہت ٹھیس پہنچی اور میں اکثر بیمار رہنے لگی—— کبھی کبھی بخار کی زیادتی ہوتی تو مجھ پر غلبہ سا طاری ہوجاتا۔ اور مجھے احساس ہوتا جیسے وہ میرے سرہانے کھڑے مجھے غور سے دیکھ رہے ہیں۔ میں انھیں دیکھ کر نادم ہوجاتی اور کہتی—— مجھے معاف کردیں۔ میں نے آپ کو بڑی تکلیفیں دی ہیں۔ وہ صرف مسکراتے رہتے۔ اُن کی مسکراہٹ سے میرا دل کھل اٹھتا۔ میری آنکھیں کھلتیں تو کہیں کوئی نظر نہ آتا۔

میں بے اختیار رونے لگتی۔ یہ بندھن ساری عمر میرے ذہن پر مسلط رہا۔ میری بیماری پر بھائی جان متفکر ضرور ہوئے۔ انھوں نے بھابی سے سخت تاکید کی میری دل آزاری نہ ہو۔

آج میری طبیعت ذرا سنبھلی تھی کہ اُن کی موت کی خبر آئی۔

اس خبر سے میرے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہونے لگے۔ میں نے دل کو بہت سمجھایا مگر ایک احساس تھا جو سارے وجود پر طاری تھا۔ میں نے محسوس کیا جیسے وہ میرے سامنے کھڑے ہوں۔ بالکل مغموم مغموم سے بالکل بجھے بجھے سے۔ میری آنکھیں کھل گئیں——!

یہ ذہنی وابستگی۔ یہ فطری ربط نہ جانے کب تک مجھ پر مسلط رہے گا۔ یہ میری زندگی کا سب سے بڑا المیہ ہے شاید——

میری زندگی تو پھول کی طرح شگفتہ ہونی چاہیے تھی مگر وہ صرف انگارے ہی انگارے ہے۔ دیکھوں ان انگاروں پر کب تک کروٹیں بدلتی ہوں۔ شاید یہی میرے غلط فیصلہ کی تلافی ہو——!

■❖■

واپسی

ہندوستان میں بورس کا وہ آخری دن تھا——

وہ نہایت اداس اور بجھا بجھا سا شام کے گہرے سایوں کو تکتا رہا، ڈیڑھ سال کی مدت میں بورس نے خود کو زندگی کے کس قدر قریب محسوس کیا تھا۔ ہندوستان کی زندگی واقعی اُسے زندگی لگی تھی۔ بالکل گنگا کی لہروں جیسی مچلتی، اٹھلاتی اور رواں دواں سی۔ ہر طرف سے آزادی کا احساس دل و دماغ پر مسلط رہا کرتا تھا۔ زندگی کسی بھی پہلو مقید یا بند محصور نہیں معلوم ہوئی تھی۔ اس نے اکثر سوچا تھا زندگی اگر چند دنوں کی ہے تو اسے ہر قید و بند سے ایسا ہی آزاد ہونا چاہیے۔ جیسا کہ اس نے ہندوستان آ کر محسوس کیا تھا۔ وقت کتنی تیزی سے بھاگتا گیا۔ ڈیڑھ سال کا وقت یکبارگی اس کے ذہن میں گھوم گیا۔

وہ آئل ریفائنری میں انجینئر تھا اور ہند سرکار کا مہمان خصوصی، وہ کارخانے کے تعمیراتی منصوبہ کے تحت ماہر خاص کی حیثیت سے یہاں آیا تھا۔ جب وہ ہندوستان کے لیے ماسکو سے روانہ ہو رہا تھا، تو اس کے ذہن میں ہندوستان کی وہ مفلوک الحالی، وہ خشک سالی، وہ قحط زدگی کا خیال تھا، جس نے دنیا کے دیگر ممالک کی ہمدردی ہندوستان کے لیے بہم پہنچائی تھی۔ بورس نہایت مغموم سا، بے دل سا ہندوستان آنے پر آمادہ ہوا تھا۔ اس نے جب ماسکو کے وسیع و عریض بین الاقوامی ایروڈرم سے پرواز کیا تھا، تو ژولی اور دو سالہ مونا اس کے ساتھ تھی۔ اسے اگر خوشی تھی تو صرف اس بات کی ژولی اس کے ہر درد میں شریک رہے گی اور پیاری سی ننھی سی گڑیا سی مونا اس کی نظروں کے سامنے۔ مگر جب

اس کے طیارے نے سرزمین ہند کو چھوا اور فضا کی خوشگواری نے ان کا خیر مقدم کیا تو اس کے دماغ میں بسا غریب ہندوستان دم توڑ چکا تھا اور پر بہار پُر فضا ہندوستان کی نظروں کے سامنے تھا۔ اور جس دن اس نے ریفائنری کے احاطہ میں قدم رکھا تو اس کے لیے دعوتِ عمل تھی۔ ہندوستانی ماہرین نے اس کا بڑا پر تپاک خیر مقدم کیا۔ ان کی مسکراہٹوں میں دوستی کا پیغام ملا۔ ڈاکٹر داس، سنہا، خان اور مکرجی اس کے بہت اچھے دوست بن گئے۔

''نمستے ـــــ! نمستے ـــــ!!'' پہلا ہندوستانی لفظ جو روسی لبوں پر مچلا اور مسکراہٹوں میں تحلیل ہوا۔

آئل ریفائنری کا کام تیزی سے ہونے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے لق ودق سے میدان میں نہرو کا خواب اپنی تمام تر خوبصورتی کے ساتھ ملک کی اقتصادیات کو مضبوط بنانے کے لیے کھڑا مسکرانے لگا۔ ہندوستانی انجینئرز کی ذہانت، پرخلوص محنت اور قومی جذبات سے وہ بے حد متاثر ہوا تھا۔ اس نے سوچا تھا نیا ہندوستان کتنی تیزی سے جنم لے رہا ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں ہندوستان نئے انداز سے آگے بڑھ رہا تھا۔ بورس فرصت کے لمحات اپنے انہیں ہندوستانی دوستوں کے ساتھ نئی نئی جگہوں، نئے نئے ماحول، نئی نئی فضاؤں کو دیکھنے میں صرف کر کے ذہنی راحت محسوس کرتا۔ ژولی اور مونا بھی ساتھ ساتھ رہتے۔

آم کے باغات، کھیتوں کی ہریالی، سادہ لوح کسانوں کا روپ رنگ، بارش کی پھوار خاص طور پر اسے بہت اچھے لگتے تھے اور اسے اس نے کیمرہ کی آنکھوں سے کاغذ پر منعکس کر کے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا تھا۔ نالندہ کے کھنڈرات میں علم ودانش کی راگنی گونجتی محسوس کی تھی، بنارس کی فضاؤں میں دھرم کا سورج چمکتا لگا تھا۔ اور اس کے ویران دل میں بھی عقیدت کی لہریں کوندی تھیں۔ آگرہ پہنچ کر تاج کے سائے میں پیار ومحبت کی ٹھنڈک محسوس ہوئی تھی اور ساری فضا پیاری پیاری سی لگی تھی۔ تاج محل کے مسحور کن حسن

سے وہ بہت دیر تک محظوظ ہوتا رہا تھا اور اس نے ژولی اور مونا کی انگنت تصویریں اس کے پس منظر میں لی تھیں۔ حسن و عشق کے اس بارگاہ سے دور جانے کی اس کی خواہش نہیں ہو رہی تھی۔ الورا اور اجنتا کی گپھاؤں میں تاریخ کے اوراق پھڑ پھڑائے تھے۔ سارا ہندوستان اس کا پُرخلوص خیر مقدم کرتا رہا اور اسے محسوس ہوا کہ یہاں کے لوگ کتنے مہمان نواز پُرخلوص اور پُر اخلاق ہیں۔ بازاروں کی سج دھج میں وہ کھویا رہا۔ ہر ذہن کو اتنا آزاد اس نے سوچا بھی نہیں تھا، جتنا دیکھا۔ بھارت اور روس کے خوشگوار تعلقات۔ نظریاتی ہم آہنگی سے بھی اسے بڑی راحت ملی تھی۔

ریفائنری ٹاؤن شپ میں رشین ہوسٹل کے ایئر کنڈیشنڈ کمرے، صاف ستھرے کچن اور روسی کھانے کے اعلیٰ انتظامات پر اُسے دلی مسرت ہوتی تھی۔ لائبریری، کامن روم اور روسی اخبارات کا بھی انتظام تھا۔ ہندوستان کے تیوہاروں میں اسے ہولی اور عید خصوصیت کے ساتھ بے حد پسند تھے۔ ہولی میں ژولی اور مونا کے ساتھ ڈاکٹر داس نے اسے مدعو کیا تھا۔ اور بے حد لذیذ ہندوستانی کھانا کھلایا تھا۔ اور سب سے بڑھ کر گلال اور عبیر لگانے میں انھیں گونا گوں مسرت کا احساس ہوا تھا۔ عید کے موقع پر خان نے اسے سوئیاں کھلائیں اور پرتپاک گلے لگایا۔ یہ تیوہار آپس میں میل و محبت بڑھانے کا وسیلہ لگا۔ اور سماج میں ایسے مواقع اچھے لگے۔

ایک ایسی بھی پُرمسرت شام بورس کی زندگی میں آئی، جب اس کی ملاقات سروج سے ہوگئی۔ سروج ریفائنری میں جی ایم کی اسٹینو تھی۔ بالکل الٹرا ماڈرن سی لڑکی۔ اس کا کتابی چہرہ، ستواں ناک اور متوازن خدوخال بورس کو بھا گیا۔ اور اس سے تقریباً روز ملنے لگا۔ سروج نے بورس کی طرف صرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ مگر بورس اسے اپنا دل دے بیٹھا؟ اس نے اپنی محبت کا اقرار اس انداز میں کیا—— سروج—— پریم—— ''بورس نے نئی نئی ہندوستانی سیکھی تھی۔ اور ٹوٹے الفاظ میں یوں ہی باتیں کیا کرتا تھا۔

جواب میں سروج صرف مسکراتی رہی۔

''تم کو برا تو نہیں معلوم ــــــ؟''

''او ــــــ نو ــــــ بورس ــــــ! نو ــــــ!!'' اور سروج کا بدن شاخِ گل کی طرح لچک گیا۔ وہ بہکتی رہی اور بورس کے چہرے پر جھکی رہی۔

''تم کتنے سندر ہو بورس ــــــ! تمہاری نیلی نیلی آنکھوں میں میرے سپنوں کی جنت ہے!'' سروج بڑی روانی میں بولتی رہی اور بورس اس کے الفاظ کی روانی سے کچھ سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔

وقت بہتا گیا ــــــ

سروج نے خیالوں میں اپنے کتنے ہی خواب بن ڈالے۔ وہ اب ژولی کی موجودگی میں بھی بورس سے ملنے لگی تھی۔ ژولی کا ماتھا ٹھنکا اور اسے اپنی روس کی زندگی یکا یک یاد آ گئی۔ سردیوں کی بھیگی شام ٹھٹھر رہی تھی۔ وہ جلدی جلدی قدم اٹھاتی ہوئی بال شوئی تھیٹر کی طرف جا رہی تھی۔ کہ یکا یک بورس سے جا ٹکرائی۔ بورس نے بڑی تیکھی نگاہوں سے اسے دیکھ کر کہا تھا ــــــ ''محترمہ! جلدی میں کبھی غلط قدم اٹھ جاتے ہیں۔ اور اس کا انجام یہ خوبصورت تصادم ہوتا ہے ــــــ جی!''

وہ کیا بولتی، صرف خوبصورت جوان کو دیکھتی ہی رہ گئی۔ جو تھوڑی دور پر جھکا اپنے بکھرے ہوئے سامان چن رہا تھا۔

''مجھے بہت افسوس ہے کہ آپ کو خواہ مخواہ تکلیف ہوئی۔''

''جی ــــــ؟ کوئی بات نہیں ــــــ!! ایسی تکلیف بڑی خوشی سے دل قبول کر لیتا ہے۔'' وہ مسکرایا۔

''جی! میرا ایسا ارادہ قطعی نہیں ــــــ'' اور پھر ملاقاتوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ کرمیلن کے قدرتی نظاروں میں وہ گم ہوتے رہے۔ ولگا ندی کی مچلتی لہروں پر ان کے دلوں کی دھڑکنیں بھی گنگناتی تھیں۔ اور التائی کی دور دراز برفیلی چوٹیوں پر ان

کے قدموں کے نشان پڑے تھے اور زندگی مسکرائی تھی۔

پھر وہ حسین صبح بھی مسکرائی جب دو زندگیاں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک ہوگئیں اور زندگی کا سہانا سفر شروع ہوگیا۔ بورس نے زندگی کی کڑی دھوپ میں اپنی ہمت اور بلند حوصلوں کے چھاؤں تلے یہ انوکھا سفر شروع کیا تھا۔ وقت بہت خوشگوار گزرنے لگا۔ ژولی کو اس سے والہانہ عشق تھا اور وہ اسے ٹوٹ کر چاہتی رہی۔ ہر غم ہر خوشی میں دونوں برابر کے شریک ہوتے۔ کبھی بورس جب فیکٹری سے نہیں لوٹتا تھا ژولی پریشان ہوکر اس کی تلاش میں نکل پڑتی اور سڑک کے کنارے نشہ میں گرے اُن تمام مردوں کے چہروں کا جائزہ لیتی رہتی اور جہاں کہیں بورس مل جاتا اسے اپنے شانوں کا سہارا دے کر کیبن تک لے آتی تھی۔ یہ تقریباً روز کا ہی معمول ہوگیا تھا۔ ژولی ایسا اس لیے نہیں کرتی تھی کہ وہ دوسری عورتوں کے چکر میں اور مردوں کی طرح پھنس جاتا، بلکہ سڑک پر ہونے والے روزانہ کے سیکڑوں حادثوں کی وہ نذر نہ ہوجائے۔ ژولی نے بورس کے مزاج میں یہ یکسانیت ضرور پائی تھی کہ وہ دوسری عورتوں سے مرعوب تو ہوجاتا تھا۔ مگر اس کے تعلقات ہمیشہ پاکیزہ رہتے تھے اور یہی سب سے بڑی راحت تھی۔ سروج کے معاملہ میں بھی ژولی تقریباً مطمئن تھی، لیکن پھر بھی وہ بورس کو ہدایت کرتی رہتی کہ یہ پردیس کا معاملہ ہے۔ قدم پھونک کر رکھنا بہتر ہے۔

اُدھر سروج سہانے سپنے دیکھا کرتی تھی بورس کی زندگی میں داخل ہوکر ایک دم اسے ہندوستانی ماحول میں ڈھال دے گی۔ روس کی سرزمین پر ایک مخلوط گھرانہ پروان چڑھے گا۔ جہاں ہندوستانی اور روسی تہذیبوں کا سنگم ہوگا اور پرکیف سی زندگی ہوگی۔ ہندوستان اور روس کا وہ پرانا رشتہ پھر سے استوار ہوجائے گا۔ جو تجارت کے سلسلہ میں سینکڑوں برس قبل شروع ہوا تھا۔ یہ رشتوں کی تجدید ہوگی۔

وقت کو سرکتے دیر نہیں لگی۔ سروج بے حد اداس تھی۔ بورس اپنے وطن واپس جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔ اور ہندوستان میں قیام کا اس کا آخری دن تھا۔

بورس کو واپس بہر حال جانا تھا کیونکہ یہ دونوں ملکوں کے درمیان معاہدہ کی رو سے یہاں آیا تھا۔ اور اس کے قیام یا واپس جانے میں اس کی اپنی مرضی کو کوئی دخل نہیں تھا۔ دہلی سے ماسکو کے لیے تین نشستیں بک تھیں اور سفارتی خط بھی اسے موصول ہو چکا تھا، بورس کا دل مرجھا رہا تھا۔ اپنے آزاد ماحول کو چھوڑنے کے غم میں۔ سروج سے بچھڑنے کے دکھ سے۔ بورس کے دوستوں نے ڈاکٹر داس، سنہا، خان اور مکرجی کے بے حد اصرار پر وہ اُس دن دہلی کے لیے روانہ نہ ہو سکا۔ جس دن دہلی کے لیے اس کی ٹکٹیں بک تھیں۔ صرف دل آزاری کے خیال کے تحت اس نے ژولی اور مونا کو دہلی کے لیے روانہ کر دیا اور خود ایک دن کے لیے رک گیا۔ وہ ژولی اور مونا سے دہلی میں دوسرے دن ملنے کا ارادہ رکھتا تھا اور پھر ماسکو کے لیے شامل پرواز ہوتا۔

بورس کے دوستوں نے کلب میں اس کے اعزاز میں نہایت پر تکلف عصرانہ دیا جس میں شہر کے تمام بڑے افسر، حکمراں اور تاجران شریک ہوئے۔ بورس کے اخلاق، مزاج کی شگفتگی اور خلوص نے تمام لوگوں کو اس کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ اس لیے سارے لوگ بڑے خلوص سے شریک ہوئے۔

دسمبر کی خنکی چبھتی چبھتی سی تھی۔ کلب کے وسیع ہال میں دودھیا روشنی میں خوشبوؤں کا سمندر تھا۔ تمام میزوں پر حسین پیکر جلوہ گر تھے۔ بورس اداس اداس سروج کے قریب سر نیچا کیے بیٹھا تھا۔ الوداعی پروگرام شروع ہوا تو سب سے پہلے ڈاکٹر داس نے بورس کی شخصیت، انسان دوستی اور خلوص پر بڑی جامع تقریر کی۔ دیگر دوستوں نے اپنے اپنے محسوسات بیان کیے اور آخر میں سروج نے اپنے تاثرات بیان کیے اور سنگ مرمر کا تاج محل اور جے جوان، جے کسان کا مجسمہ بورس کی نذر کیا۔ سارا ہال تالیوں سے گونج گیا۔

پھر جام سے جام ٹکراتے رہے اور رات بھیگتی رہی۔ موسیقی کی دھیمی دھیمی لہریں فضا میں تیرتی رہیں۔ جسم سے جسم ٹکرا کر تھرکتے رہے۔ بورس ڈانسنگ فلور پر بہکے ہوئے

قدموں سے لڑکھڑاتا رہا۔ سروج اسے جام پر جام دیتی رہی۔ بورس نے آخری رات سمجھ کر بے تحاشا پی لی اور مدہوش ہوتا گیا۔

رات کے دو بجے نورونغمہ کا دور تھا اور سبھی دوستوں سے رخصت ہوتے ہوتے تین بج گئے۔ سروج نے سہارا دے کر بورس کو کیبن تک پہنچایا۔ وہ سروج سے جنون میں کیا کچھ کہتا رہا۔ سروج کا دل بیٹھا جاتا رہا۔ اسے کیبن میں چھوڑ کر اپنے کوارٹر پانچ بجے گئی۔ اور بورس اپنے بیڈ پر گرا تو نشہ کی غنودگی اور نیند کے غلبہ کے اثر سے بے خبر پڑا رہا۔

صبح کا سورج آسمان کے مشرقی کنارے پر چمکا۔ بورس اپنے کمرے میں بند رہا۔ آج صبح دس بجے ہی اسے دہلی کے لیے روانہ ہوجانا تھا۔ دوستوں نے دھیرے دھیرے آنا شروع کیا اور بورس کو سویا پاکر متعجب ہوئے۔ لوگوں نے کالنگ بیل بجائی، مگر کوئی جواب نہ آیا۔ نو بج گئے۔ لوگوں کی تشویش بڑھ گئی۔ آخر میں دستک دی گئی لیکن پھر بھی کوئی جواب نہ آیا۔ باہر سے کافی شور مچایا گیا پھر بھی خاموشی رہی۔ ڈاکٹر داس بے حد پریشان ہوگئے اور انھوں نے کواڑ توڑنے کی تجویز دی۔ کواڑ توڑ کر جو کھولا گیا تو کمرہ میں دھواں ہی دھواں تھا، کوئی چیز صاف نہیں دکھائی دے رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد دھواں صاف ہوا تو بورس کو آواز دی گئی۔ مگر اس کا کہیں پتا نہیں تھا۔ دوستوں کی تشویش میں اضافہ ہوا۔ جب بیڈ کوشن دیکھا گیا تو وہ جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ راکھ کے ڈھیر پر انسانی جسم کے خدوخال نمایاں تھے اور سنگ مرمر کا تاج محل دھوئیں سے سیاہ ہوگیا تھا۔ موجودہ لوگوں پر بجلی گر گئی۔ بورس جل چکا تھا۔

مزید جانچ پر یہ اندازہ لگایا گیا کہ بورس نشے کے عالم میں ہاتھ میں سگریٹ لیے کوشن پر سو گیا تھا اور کوشن جل گیا۔ مگر بورس ہوش میں نہ آیا۔ اس کا وجود دھویں میں تحلیل ہوگیا۔ اور ہندوستان کی ہواؤں میں تحلیل ہوگیا۔

سروج پر بے ہوشی طاری ہوتی رہی۔

دہلی کے پالم ہوائی اڈے پر ژولی، مونا کو گود میں لیے بار بار گھڑی دیکھتی رہی۔

اسی درمیان وائرلیس سے اس کی موت کی خبر متعلقہ افسروں کو دی گئی اور اس کی موت کا اعلان کر دیا گیا۔ ژولی کی فلک شگاف چیخ فضا میں بلند ہوئی اور اس کا سارا وجود زمین پر آ گرا۔

روسی سفارت خانے نے معاملہ کی مزید تحقیقات کی اور حکومت روس کو اس کی موت کا پُر درد پیغام بھیج دیا گیا۔ حکومتِ ہند نے اپنے غم و افسوس کا اظہار پُر درد انداز میں کیا۔

بورس کی روح ہندوستان کی ان آزاد فضاؤں میں تیرتی رہی، جس میں اس نے آزادی کے احساسات کی لذت پائی تھی——

■❖■

بے گناہ

اس شخص نے انسپکٹر کمار کو کافی حیرت زدہ کر دیا تھا——! آج تک یہاں ایسا کوئی بھی مجرم نہیں آیا تھا، جس نے اپنے جرموں کا اقرار اپنی زبان سے کیا ہو۔ لیکن اس پُر اسرار شخص نے اپنے تمام کارنامے ظاہر کرنے کی خواہش کی۔ پہلے تو انسپکٹر کمار نے اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھا، لیکن اسے سمجھ نہ سکا۔ انسپکٹر اس کی ہیئت کو کافی غور سے دیکھنے میں منہمک ہو گیا۔ اس کی ہفتوں سے بڑھی ہوئی داڑھی، بوسیدہ کپڑے اور چہرے پر ابھرے ہوئے نقوش اس کی شدید ترین پریشانی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ انسپکٹر کے دل میں اس شخص کے لیے ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ اس کی شخصیت نے اسے کافی متاثر کر دیا تھا۔ خود انسپکٹر کمار اپنے دل کو موم ہوتے دیکھ کر گھبرا سا گیا۔

''تو آپ اپنے جرموں کا اقرار کرنا چاہتے ہیں؟'' انسپکٹر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''......................'' وہ خلا میں جھانک رہا تھا۔

''آپ نے کون سا جرم کیا ہے——؟''

''میں نے اپنی بیوی کا خون کیا ہے!۔۔۔۔ خون!!''

''کب۔۔۔۔؟ کہاں۔۔۔۔؟'' انسپکٹر کی آواز میں گھبراہٹ تھی اور نظروں میں چمک۔ وہی چمک جو کسی جواری کی نظروں میں بازی جیتنے کے احساس کے تحت پیدا ہوتی ہے۔

''آج سے تین سال قبل۔۔۔۔!'' اس کا سیدھا سا جواب تھا۔

انسپکٹر نے سامنے والی Cabinet سے ایک فائل نکالی جو خون سے متعلقہ تھی۔ آج سے تین سال قبل اُسے ایک خون کا کیس ملا تھا۔ جس کے مجرم کا پتہ اب تک نہیں لگایا جاسکا تھا۔ انسپکٹر نے ایک بار پھر اُس شخص کی طرف تلخ نگاہوں سے دیکھا وہ سامنے دیوار سے آویزاں کلینڈر کو غور سے دیکھ رہا تھا اور اس کے خشک لبوں پر مسکراہٹ کی مہین سی لکیر پھیلی ہوئی تھی وہ انسپکٹر کی آواز سے چونکا:

''کیا نام تھا تمہاری بیوی کا۔۔۔۔؟''

''جی۔۔۔۔! نیلم۔۔۔۔!!'' اس کی مسکراہٹ کافور ہوگئی اور آنکھوں میں آنسو کے چند شفاف قطرے تھر کنے لگے۔

انسپکٹر نے پھر فائل کی طرف دیکھا۔ اس میں بھی نیلم کا ہی خون ہوا تھا۔

''تم اپنے جرم کے متعلق کیا کہنا چاہتے ہو؟'' انسپکٹر نے فائل کی طرف نظر کرتے ہوئے کہا۔

میں آپ کو سب کچھ بتا دینا چاہتا ہوں لیکن کسی خوف و ہراس کے تحت نہیں، بلکہ میرا ضمیر مجھے چین نہیں لینے دیتا ہے۔ مجھے رہ رہ کر اس غار کی طرف لے جانا چاہتا ہے جس میں میری زندگی کی رعنائیاں پوشیدہ ہیں جس میں میرا وجود پنہاں ہے اور جس سے میں اب تک ڈرتا آیا ہوں وہ غار نہیں بلکہ آرزوؤں کا محل ہے جس کو میں نے خود اپنے

ہاتھوں سے ہی مسمار کر ڈالا ہے، جس کے ریزے ریزے میں میری زندگی کی دھڑکنیں ہیں۔ میری زندگی کے نازک تاروں کے ساز ہیں، سنگیت ہیں اور نہ جانے کتنے ادھورے گیتوں کی مالائیں ہیں۔ جو ایک ناموافق جھٹکے کی زد میں آ کر چاروں طرف بکھر گئی ہیں اور جب کبھی میری نظر اُن مالا کے موتیوں پر پڑ جاتی ہے وہ میری نظروں میں کانٹا بن کر چبھنے لگتے ہیں۔ اور میری روح کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں ایک فلم ڈسٹری بیوٹر کا منیجر تھا۔ میرے پاس پیسے تھے، عزت تھی، چاہت تھی، نیلم سے میری پہلی ملاقات ایک دوست کی شادی کے موقع پر ہوئی تھی۔

''آپ سے مل کر بڑی مسرت ہوئی۔'' اس نے جیسے پھول برسائے تھے۔ آنکھوں سے شرم وحیا کی چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں اور لبوں سے امرت کی مہین سی دھارا بہہ نکلی تھی جو میرے وجود پر چھا رہی تھی۔

میں نے جواب میں مسکراہٹ پھیلا دی اور دستِ چاہت خود بخود اس کی طرف بڑھ گیا تھا۔

ملاقاتیں بڑھتی گئیں۔

کلب، سنیما اور پارک اور نہ جانے کہاں کہاں بہاروں کے ذرات بکھیرے گئے۔ ہر طرف رعنائی تھی۔ ہم دونوں نے دل کی لہک اور مدھر دھڑکنوں کے ساز پر نہ جانے کتنے گیت گائے۔ آشاؤں کے ان گنت دیپ روشن کیے، جس کی روپہلی کرنوں نے دل کے تمام تاریک تر کونوں کو پُر نور کر دیا۔

نیلم کی خاموش زندگی میں ایک حسین انقلاب آ گیا۔ نیلم جو ماں باپ کے پیار کی پیاسی تھی، اسے ایک چاہنے والے کی محبت کی اتھاہ دولت مل گئی تھی۔ وہ دولت جس

کے تانے بانے پر تاج کی خوبصورت عمارت کی بنیاد ہے، کیٹس اور شیلے کی نظموں کی رعنائیاں ہیں اور اوتھیلو کی کربناک کہانی کا جال بنا ہوا ہے——!!

وقت بہتا گیا——!

میں نے زندگی کی پُر پیچ راہوں پر ایک ساتھ چلنے کا عہد کرلیا۔ والدین کو خطوط لکھے۔ جواب میں خاموشی رہی جس سے اُن کی عظیم ترین خفگی کا اظہار ہوا۔ خفگی بجا تھی، میری ہستی سے ان کی لاکھوں امیدیں وابستہ تھیں۔ اور پھر میری شادی بھی ایک اچھے کھاتے پیتے گھرانے کی سوشیل لڑکی سے طے کرلی گئی تھی۔ سچ پوچھئے تو میں انھیں منہ دکھانے کے قابل نہ تھا۔ میں نے والدین کی پرواکیے بغیر نیلم سے شادی رچالی۔

زندگی کے خواب حسین سے حسین تر ہوگئے۔ تصور کے اڑان آسمانوں کی بلندیوں کو چھونے لگیں، دل میں امنگوں کا نیا سورج پھوٹ پڑا۔

لیکن کچھ ہی دنوں بعد نیلم کی آنکھوں میں فریب کا رنگ جھلکنے لگا، اس کی دلچسپی کمل سے بڑھ گئی تھی۔ کمل میرا پرانا ساتھی تھا، جس نے میری زندگی کے ساتھ بہت گہرا مذاق کیا۔ ایک دن میری طبیعت کچھ مضمحل سی ہورہی تھی اور آفس سے جلد ہی واپس چلا آیا۔ شام کا دھندلکا بڑھ رہا تھا۔ ہوا میں قدرے سردی سموچکی تھی۔ ڈرائنگ روم میں نیلم کمل کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھی۔ میں نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا، لیکن وہ میری نظروں کا مفہوم سمجھ نہ سکی۔ اس نے مجھے بتایا کہ کمل ابھی فوراً ہی آیا ہے اور میرا انتظار کررہا تھا، لیکن ایش ٹرے میں ٹھونسے ہوئے سگرٹوں کے ٹکڑے، ڈرائنگ روم کی فضا کو دودھیائے بناتے ہوئے دھوئیں یہ بتارہے تھے کہ کمل گھنٹوں سے بیٹھا تھا۔

میرے اندر چھپا ہوا مرد کراہ اٹھا۔ نیلم سراپا دھوکا نظر آنے لگی۔ سپنوں کی نئی دنیا کا تخیل سینے میں بوجھ بن گیا۔ میں شدتِ غم سے نڈھال ہوگیا۔ نیلم مجھے سمجھ نہ سکی اور میں

اپنی ذہنی کیفیت اس پر ظاہر بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ دل میں کئی طوفان اٹھے جس میں غرق ہو کر ہمیشہ کے لیے سو جانا چاہتا تھا۔ نیلم کا حسن مجھے ڈسنے لگا۔ میرے سامنے اب صرف ایک مسئلہ تھا۔ اپنی زندگی تباہ کرنے کا مسئلہ ——! نیلم کی زندگی لینے کا مسئلہ ——!!

نفرت کی آگ میرے سینے میں بڑھ چکی تھی لیکن میں نے اس آگ کی ہلکی سی حرارت بھی نیلم کو نہیں لگنے دی۔

اتوار کا دن تھا۔ صبح کے ساڑھے نو بج رہے تھے، میں سویرے کا اخبار لیے ہوئے ہی اپنے دوست ڈاکٹر کوہلی کے یہاں چلا گیا۔ جن کا مکان بالکل قریب ہی تھا۔ ڈاکٹر کوہلی ریڈیو سے بکھرتے ہوئے نغموں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ میں بھی کچھ دیر محظوظ ہوتا رہا۔ ڈاکٹر نے Married Life پر ایک چھوٹی سی تقریر شروع کر دی۔ میں دس بجے Marketing کا بہانا کر کے واپس آ گیا۔ نیلم میرا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی مسکرا پڑی۔ میں بھی پلنگ پر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ وہ بلا کی حسین معلوم ہو رہی تھی۔ اس کی مصنوعی معصومیت سے نکلتی ہوئی تیز سی کرن مجھے جلا کر خاک کر دینا چاہتی تھی۔ میں نے اس کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ لیکن اس کی زلفوں کی دو بڑی بڑی لٹیں مجھے ناگن کی طرح معلوم ہوئیں، جو مجھے ڈس کر ابدی نیند سلا دینا چاہتی تھیں۔ یکا یک مجھے اس مسئلہ کا حل مل گیا۔ میں نے اپنے ہاتھوں کو آگے بڑھا کر اس کی گردن کے قریب کر دیا۔ میرے ہاتھوں کی گرفت سخت ہو گئی تھی اور دونوں ہتھیلیوں کی دوری بالکل کم ہو گئی۔ نیلم کے منہ سے خفیف سی چیخ نکلی اور ہوا میں تحلیل ہو کر رہ گئی۔

دیپک بجھ چکا تھا۔

میں نے اس کی کلائی سے بندھی ہوئی گھڑی کو کھول لیا اور سوئی کو آدھ گھنٹے پیچھے گھما کر پلنگ کے نیچے گرا دی۔ گھڑی کی حرکت بند ہو چکی تھی۔ میں نے پلنگ پر بچھے

ہوئے بستر کو بے ترتیب کر دیا اور تکیہ گرا دیا تا کہ دیکھنے والے کو پلنگ پر ہونے والی شدید ترین لڑائی کا گمان ہو۔

دس منٹ کے بعد میں نے ڈاکٹر کو ہلی کو نہایت المناک لہجہ میں فون کیا۔ ڈاکٹر آچکا تھا۔ میں نے المیہ ایکٹنگ دلیپ کمار سے بھی زیادہ اچھے انداز میں نبھائی۔ ڈاکٹر پولیس کو فون کر چکا تھا۔ تھوڑی دیر بعد پولیس آدھمکی۔ نیلم کی موت کا وقت اس کی ٹوٹی ہوئی گھڑی سے ساڑھے نو بجے نوٹ کر لیا گیا۔

مجھے کوئی مجرم نہیں کہہ سکتا تھا۔ ڈاکٹر شاہد تھا کہ میں اس وقت اُس کے ساتھ تھا۔ میری ظاہری افسردگی میں فاتحانہ مسکراہٹ پنہاں تھی۔ میں نے دل کی گہرائیوں میں جھانکا جہاں امید کی شمعیں روشن تھیں اور خوشی کا خاموش دریا موجزن تھا۔

اتنا کہہ کر اس شخص نے اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے چھپالیا۔

''میں جانتا ہوں انسپکٹر ——! لوگ مجھے پھانسی پر لٹکا دیں گے ——؟'' اس نے منہ چھپاتے ہوئے کہا۔

''ہاں! مجھے یقین ہے ایسا ہی ہوگا ——!!'' انسپکٹر کمار نے قدرے اطمینان سے کہا۔ وہ آفس کے ماحول کو اطمینان سے گھور رہا تھا۔

انسپکٹر کمار کو یکا یک خیال آیا۔

''تم تین برسوں تک کیا کر رہے تھے۔ معلوم ہوتا ہے............

''جی ——! میں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور بینک بیلنس وتھڈرا کر کے زندگی کے بچے کچھے لمحے کاٹنے لگا۔ اس شدید خوشی نے میری صحت پر اتنا اثر ڈالا کہ............''

انسپکٹر نے دوسرا سوال کیا۔

''آخر تم یہاں کیوں آئے ــــ؟ جرم کا اقرار کیوں کیا جبکہ تمہیں کوئی خواب میں بھی مجرم نہیں سمجھ سکتا تھا۔''

''میں کیوں آیا ــــ؟ ہاں! کیوں آیا ــــ میں نہیں جانتا ــــ میں جانتا ہوں ــــ نیلم کی آنکھیں۔ وہ دیکھو ــــ وہ ــــ وہ ــــ کلینڈر میں ــــ''

انسپکٹر بول اٹھا ''چپ رہو ــــ!''

انسپکٹر نے دو کانسٹبل کو بلایا اور اس شخص کو سلاخوں والی کوٹھری میں بند کرنے کا حکم دیا۔ ابھی کانسٹبل اس شخص کی طرف بڑھ ہی رہے تھے کہ ڈاکٹر کوہلی دو آدمیوں کے ساتھ آفس میں داخل ہوا۔

''اچھا ہوا ہم لوگ وقت پر پہنچ آئے۔ میں جانتا ہوں اس نے اپنی بیوی کو قتل کرنے کی کہانی سنائی ہوگی ــــ'' ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا ــــ

''جی ہاں ــــ! مجھے سب کچھ معلوم ہوگیا۔ اب کارروائی شروع کی جائے گی ــــ''

انسپکٹر کمار نے ایک ہی سانس میں کہا۔

ڈاکٹر کوہلی ہنس پڑا۔

''آپ اس کا کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ صبح گیارہ بجے دماغی شفاخانے سے بھاگ نکلا ہے اور میرے warders اسے ابھی فوراً واپس لے جائیں گے۔''

انسپکٹر متحیر ہوگیا۔

ڈاکٹر نے پھر کہنا شروع کیا: ''دراصل اس نے اپنی بیوی کا قتل نہیں کیا ہے اس کی بیوی دل کی مریضہ تھی۔ یہ اسے بہت پیار کرتا تھا، اپنی زندگی سے بھی زیادہ ــــ لیکن قسمت نے اس کے ساتھ عجیب کھیل کھیلا ہے۔ اس کی نظروں کے سامنے اس کے

قلب کی دھڑکنیں ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی تھیں اور یہ کچھ نہ کرسکا تھا۔ اس کے لیے ساری دنیا ویران ہوگئی۔ اس کا دماغی توازن جاتا رہا اور اس نے جو کچھ بھی آپ سے کہا ہے وہ بکواس ہے۔۔۔۔! محض بکواس۔۔۔۔!!"

انسپکٹر خاموش تھا۔ اس کا دماغ چکرا گیا۔ وہ اتنے پرانے مجرم کو پکڑ نہ سکا۔۔۔۔!

■❖■

دلِ ناداں

ابھی فوراً ہی بارش ہو کر تھمی تھی۔ اودی اودی گھٹائیں دھیرے دھیرے پورب کی جانب اس طرح سرک رہی تھیں جیسے کوئی برہن کسی کی یاد میں آنسو بہا کر آنکھیں پونچھتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف جارہی ہو۔ ہوا میں سوندھی سوندھی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ دھوپ کی سنہری کرنیں بھیگی بھیگی زمین پر پڑ کر ایک عجیب سا سماں باندھ رہی تھیں۔ موسم بڑا ہی خوشگوار ہوتا جارہا تھا۔

لیکن نکہت آج اداس تھی۔ پتہ نہیں کیوں آج اس کی طبیعت کسی کام میں نہیں لگ رہی تھی۔ ارشد کے دفتر چلے جانے کے بعد تو وہ اور بھی بور ہو رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ آج ارشد کو دفتر نہ جانے دے مگر وہ ارشد سے کچھ نہ کہہ سکی۔ اس نے اپنا دل بہلانے کے لیے ارشد کی شلف سے کچھ کتابیں چنیں۔ ناگاہ اس کی نظر ارشد کی ایک پرانی ڈائری پر پڑی۔ بڑے اشتیاق سے اسے کھولا۔ پہلے ہی صفحہ پر لکھا تھا:

"ڈائری کو زندگی کا بہترین ساتھی کہا گیا ہے۔ اس لیے کہ اس کے ہر صفحہ پر عہد ماضی مسکراتا رہتا ہے۔ اور نہ جانے کتنی ہی کہانیاں انگڑائیاں لیتی رہتی ہیں۔ ان کہانیوں میں زندگی کا راز بھی رہتا ہے اور تجربوں کا خزانہ بھی۔ کچھ پیاری پیاری یادوں کی شیرینی بھی رہتی ہے اور کچھ تلخ حقیقتوں کی چبھن بھی۔ میری ڈائری بھی زندگی کے غموں اور خوشیوں کی سنگم ہے۔ اس کی تمام باتیں حقیقت اور سچائی پر مبنی ہیں۔ ارشد"

نکہت نے اوراق الٹے............سامنے لکھا تھا——————

”۲۳/اپریل ۱۹۵۸ء

فصل گل نے اپنا جادو سارے جہان میں جگادیا ہے۔ ہر طرف رعنائیاں ہیں مگر میرا دل ان رعنائیوں سے بہل نہیں رہا ہے۔ بس ایک خیال ہے جو دماغ کو پاگل بنائے ہوئے ہے۔ ایک خلش ہے جو جگر میں تیر رہی ہے۔ کاش وہ مجھے مل جاتی جسے میں خیالوں میں ہی پوجتا ہوں............!!.........“

نکہت نے تاریخ کو ایک بار پھر غور سے دیکھا۔ ۲۳/اپریل ۱۹۵۸ء صاف صاف لکھا ہوا تھا۔ اس نے سوچا یہ تو ان دنوں کی بات ہے جب ان کی مجھ سے شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔

اس نے آگے کے صفحوں کو پڑھنا شروع کیا۔

”۲۵/اپریل ۱۹۵۸ء

ایک لگن ہے جو جی میں اگن بھر رہی ہے۔ ایک گیت ہے جو دماغ میں سرور گھول رہا ہے۔ ایک سنگیت ہے جو شاید زندگی کے تاروں پر تھرکنے لگے۔ مجھے تو بس اسی دن کا بے قراری سے انتظار ہے ——————“

نکہت نے ایک عجیب سی گدگدی محسوس کی اور دوسرے ورق پر نگاہ دوڑانے لگی۔ لکھا تھا ——————

”۱۵/مئی ۱۹۵۸ء

آج کی صبح شاید خوشیوں کا پیغام لے کر آئی ہے۔ میں آج 'صنم' سے ملنے جا رہا ہوں جس کے لیے میری روح تڑپ رہی ہے، جس کے بغیر مجھے دنیا ویراں سی بستی معلوم ہو رہی ہے۔ یہ پریشانیوں اور الجھنوں کا زمانہ، نہ جانے کب تک قسمت میں لکھا ہے۔ آخر کسی چیز کی حد ہوتی ہے —————— میں صبر کا دامن آخر کب تک تھامے رہوں!..................“

پھر ورق الٹ گیا ——————

''۱۷رمئی ۱۹۵۸ء

ان حسرتوں سے کہہ دو کہیں اور جا بسیں
اتنی جگہ کہاں ہے دل داغ دار میں

ایک حسرت تو دل میں ہی رہ گئی۔ کاش اسے دیکھ پاتا۔ بس اپنا فرض تو کوشش کرنا ہی رہ گیا ہے کامیابی خدا کے ہاتھ میں ہے۔''

نکہت کے چہرے پر پریشانیوں کے نقوش ابھرتے رہے ——— !

اس نے ایک ورق اور الٹ دیا —— !!

''۱۹رمئی ۱۹۵۸ء

امید کی ایک مہین سی کرن چمکی ہے۔ ممکن ہے دل کی تمنا پوری ہو جائے۔ شاید میں اسے پاسکوں.................''

نکہت نے جل کر کچھ اور اوراق الٹ دیے۔

''۳رجون ۱۹۵۸ء

بات ابا کے کانوں تک پہنچ چکی ہے۔ میں عجیب کشمکش میں مبتلا ہوں۔ وہ نہ جانے کیا کیا سوچتے ہوں گے۔ میں نے سوچا تھا اسے پا کر ہی انھیں بتاتا۔ اماں بھی عجیب ہیں؟............''

اس نے پھر اوراق الٹے ———

''۱۲رجولائی ۱۹۵۸ء

میں اسے اپنی مایوسیوں کا حال کیسے بتاؤں؟

اسے کیسے بتاؤں کہ میں اس کے لیے کتنا بے چین ہوں............؟............''

نکہت کے ذہن میں ارشد کا مسکراتا ہوا چہرہ ابھرا اور اسے محسوس ہوا جیسے وہ کہہ رہا ہو ——— ''نکہت تم ہی نا کہتی تھیں مردوں کا کچھ اعتبار نہیں ہوتا ——— وہ نہ جانے کب دغا دے دیں ——— !

تم ٹھیک ہی تو کہتی تھیں، مردوں کا کچھ اعتبار نہیں ہوتا—— وہ نہ جانے کب دغا دے دیں۔ تم ٹھیک ہی تو کہتی تھیں، مردوں پر بھروسہ کرنا بے وقوفی ....''

اور نکہت کی پلکوں پر شبنم کے قطرے تیرنے لگے..........اس نے بے دلی سے پھر کچھ اوراق الٹے——

''۱۸/اگست ۱۹۵۸ء

آج کی رات آنکھوں میں ہی کٹی۔ رات بھر بے چین سا رہا۔ کچھ راستہ نظر نہیں آ رہا ہے۔ کچھ سوچ ہی نہیں پا رہا ہوں۔ کیا کروں آخر ایک خیال ہے جو ہمیشہ مجھے بے چین کیے ہوئے ہے۔ سوچتا ہوں ....

تو جو نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے

اگر وہ نہ ملی تو یہ زندگی کیسے کٹے گی۔ میری تو بس موت ہی ہو جائے گی..........

یہاں پر آ کر نکہت تو رک گئی لیکن اس کے آنسو نہ رک سکے۔ اسے ارشد پر بڑا غصہ آیا۔ اس کی تمام پیار بھری باتیں یکبارگی ذہن میں گھوم گئیں۔ اسے ایسا احساس ہوا جیسے وہ تمام باتیں خواب میں ہوتی تھیں، اس کا گلا رندھ گیا——

کچھ اوراق اور الٹ گئے——

''۲۷/اگست ۱۹۵۸ء

آج سویرے ہی سے طبیعت پریشان ہے۔ کہیں بھی جی نہیں لگ رہا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے ان مایوسیوں کا دور ختم نہیں ہوگا۔ زندگی کی حسرتیں شاید دل میں ہی دفن ہو کر رہ جائیں گی۔ اس زندگی کی لطافتوں سے دل نا آشنا ہی رہ جائے۔ حالات کی ستم ظریفیوں کا گلہ کس سے کروں..........؟ زمانہ سے یا قسمت سے..........؟''

دوسرے صفحے پر لکھا تھا——

''۲۹/اگست ۱۹۵۸ء

ایک موہوم سی امید جینے پر مجبور کر رہی ہے۔ اقبال کا ابھی خط آیا ہے۔ اس

نے اس کافرادا تک کی رسائی کی بڑی اچھی راہ دکھائی ہے۔اب مجھے اقبال کے پاس جانا ہی ہوگا......"

نکہت کے ذہن میں ایک بار پھر ارشد کا مسکراتا مسکراتا سا چہرہ ابھر گیا۔اس کی مسکراہٹ میں پھر اسے تصنع کی بوآئی۔اس نے سوچا یہ چہرہ جوخوشی اور پیار سے ہمیشہ دمکتا رہتا ہے، کتنا پرفریب ہے۔اس میں کتنا زہر ہے، کتنی تلخی ہے۔اس کا پیار کتنا جان لیوا ہے۔ اور نکہت کا دل اس کربنا کی پر ایک بار پھر رو اٹھا۔وہ خود پر قابو نہ پا سکی اور بلک پڑی۔

اس کی نظریں اپنے اجنبی دشمن کا نام ڈھونڈھ رہی تھیں ———

"۳ر ستمبر ۱۹۵۸ء

آج اقبال کے پاس پٹنہ پہنچ گیا ہوں۔ایک امید ہے جس پر زندگی ٹھہری ہوئی ہے۔ اقبال کی باتوں سے بڑی ہمت ہورہی ہے، ممکن ہے اقبال کی ہی کوششوں سے اپنے مقصد کا ستارہ چمک اٹھے۔کاش اسے پاسکوں............"

"مردودلڑکی ——" نکہت بڑبڑائی۔

"۵ر ستمبر ۱۹۵۸ء

لاگی نہیں چھوٹے راما چاہے جیا جائے

اقبال کے دفتر میں اس کی ایک جھلک دیکھ کر تڑپ گیا۔

اب اس کی جفائیں اور بے رخی بہت زیادہ بڑھتی جارہی ہیں۔لیکن میں نے بھی حوصلہ کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔اس کی بے رخی کو ایک دن لطف وکرم میں بدل کر ہی دم لوں گا............"

نکہت پاگل ہورہی تھی۔اسے ارشد کے ساتھ گزارے ہوئے اب تک کے تمام حسین لمحات کی یاد آنے لگی جو نشتر بن کر روح کی گہرائیوں میں سرایت کررہے تھے۔ اسے ایک عجیب سی الجھن ہوگئی۔دنیا ویران معلوم ہونے لگی۔اسے اپنے ہستی پر رحم آنے لگا۔اس نے سوچا "ارشد کی زندگی میں جب اتنا بڑا طوفان برپا تھا تو میں ان کی زندگی

میں داخل ہونے کا کیا حق رکھتی تھی۔ میں نے ہی ان کی خوشیوں کو چھین لیا ہے۔ میں تو واقعی ایک مجرم ہوں۔ زندگی اب ایک دوراہے پر آن کھڑی ہے۔ ایک طرف ارشد کا پیار ہے اور دوسری طرف اس کی خوشیاں ہیں جو اسے اپنی طرف بلا رہی ہیں۔ میں ارشد کو اس کی خوشیوں کی راہ پر لگا کر خود کو غم کے دبیز پردوں میں چھپا لوں گی۔ میں ایک عورت ہوں جس کی ہستی ہی قربانیوں کے لیے وجود میں آئی ہے۔"

وہ پھر رونے لگی۔

اس نے پھر پڑھنا شروع کیا——

"۲۵/ اکتوبر ۱۹۵۸ء

آج اماں بہت خوش ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی ان کا دل کھل اٹھا ہے۔ میں جانتا ہوں میری شادی کی بات چیت آخری مرحلے طے کر چکی ہے۔ لیکن میرے لیے یہ مژدہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس خبر سے مجھے بڑی کوفت ہو رہی ہے۔ میں نہیں چاہتا کسی کو اپنی زندگی میں خواہ مخواہ گھسیٹ لوں۔ کسی کی زندگی تلخ کر کے مجھے کیا ملے گا؟ چند افکار......! چند پریشانیاں..........اور بس!"

میں تو اب بھی تمہاری زندگی سے جدا ہونے کو تیار ہوں۔ وقت زیادہ نہیں گزرا ہے اچھا ہوا تم نے اپنی حقیقت جلد ہی مجھے بتا دی۔ نکہت کی بھنویں تن گئیں——

"۳۱/ اکتوبر ۱۹۵۸ء

شادی کی باتیں گرم ہیں۔ میں اب اماں کو اپنے جی کی بات صاف صاف بتا دوں گا۔ آخر شادی کی اتنی جلدی کیا ہے۔ آخر مجھے بھی تو اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کا حق ہے۔ میں مانتا ہوں کہ والدین کبھی بھی اولاد کی برائی کے خواہاں نہیں ہوتے، تاہم میں پنی اچھائی اور برائی کو خود سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔ میں بھی اپنی ذمہ داریاں سمجھتا ہوں.........."

نکہت رو رہی تھی——

''۲رنومبر ۱۹۵۸ء

عجیب سی کشمکش میں مبتلا ہوں۔ کچھ سوچ نہیں پا رہا ہوں۔ آخر کروں تو کیا کروں، بھلا جسے دیکھا نہیں، جسے پرکھا نہیں، اسے یکا یک زندگی میں کیسے شامل کرلوں۔ اس کہنہ روایت کی ترمیم ضروری ہے۔ یہ شادی کتنا بڑا Risk ہے............''

''۵رنومبر ۱۹۵۸ء

شادی کی تیاریاں مکمل ہوگئی ہیں۔ میری کوششیں بے سود ہوگئیں۔ اب تو نجات کی کوئی صورت نہیں..................''

گویا میں ایک بلائے جاں ہوں جسے نجات کے طلبگار ہیں۔! جی جناب! یہ نجات تو کب کی ہی مل گئی ہوتی اگر آپ مجھ سے کبھی بھی اس کا ذکر کرتے —— کہاں ہیں آپ ——!؟

نکہت غصہ سے تھر تھر کانپ رہی تھی ——————

''۱۰رنومبر ۱۹۵۸ء

آج اپنی ڈائری کے پچھلے صفحوں پر نظر پڑ گئی، اپنی گزشتہ زندگی کی حسرتوں پر بڑا افسوس ہوا اور خود پر رحم آیا۔ لیکن ایک لا ابالی سا سوال بھی ذہن میں ابھر آیا۔ ایک منٹ کے لیے سوچنے پر مجبور ہوگیا ہوں کہ شاید ان صفحات پر کبھی میری ہونے والی شریکِ حیات (جسے میں خود ابھی نہیں جانتا) کی نظر پڑ گئی تو نہ جانے ان کے نازک سے دل پر کیا کیا گزرے گی..................!''

''بڑا خیال ہے میرا ——————! بہت بہت کرم ہے آپ کا جناب ——!! کم از کم اتنا تو خیال آیا کہ کسی خانماں برباد کا ——!؟''

نکہت پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ اس نے ٹھان لی تھی کہ آج ہی شام کی ٹرین سے اپنے میکے چلی جائے گی تا کہ اس کا منحوس سایہ بھی اب ارشد پر نہ پڑ سکے ——————

''۱۵رنومبر ۱۹۵۸ء

آج کی صبح اپنے ساتھ مسرتوں کا پیام لے کر نمودار ہوئی ہے۔ آج میں کتنا خوش ہوں۔ شاید اتنی خوشی اور کبھی میسر نہ ہو سکے۔ خوشی کے مارے میں پاگل ہو جاؤں گا۔ اپنی خوشی کے اظہار کے لیے الفاظ ہی نہیں مل رہے ہیں۔ میں نے اسے آج پالیا ہے——"

نکہت نے ڈائری زور سے دور پھینک دی۔ اس کا سارا جسم غصہ سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اگر ارشد ابھی آجاتا تو وہ اس پر بری طرح برس پڑتی——

ڈائری اس نے پھر ا یکبارگی اٹھالی اور اس اَن جانے دشمن کا نام جاننے کے لیے بے تابی سے دوسرے صفحوں کر پڑھنے لگی——

"۲۰ر نومبر ۱۹۵۸ء

میری معشوقہ میرے ساتھ ہے۔ اسے پا کر میں کتنا خوش ہوا ہوں۔ اسے معشوقہ نہ کہوں تو اور کیا کہوں؟ اگر فرہاد نے شیریں کے لیے تیشے سے دودھ کی نہریں کھودی تھی تو میں نے بھی اس کے لیے آسام کے جنگلات میں سفر کیے ہیں۔ اگر مہی وال اپنی سوہنی کے لیے دریا میں غرق ہوا تھا تو میں فاقوں کے آتشیں دریا میں کئی دنوں تو غرق رہا ہوں۔ اگر رومیو دل کی تمنا دل میں لیے چل بسا تو میں بھی اپنی ناکام حسرتوں کا جنازہ دل میں لیے کب تک گھوما ہوں—— میرے معشوقہ —— میری نوکری مجھے مل گئی............زندگی کا کچھ تو سہارا میسر ہوا——"

نکہت حیرت سے بت بن گئی تھی۔ اس کے دل میں ارشد کے لیے بے پناہ پیار امنڈ آیا۔

ارشد کے دفتر سے آتے ہی اس نے دوڑ کر بری طرح بھینچ لیا۔ ارشد متحیر تھا کہ آخر ماجرا کیا ہے۔

نکہت نے جب اسے ساری باتیں بتائیں تو وہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گیا اور نکہت مارے شرم کے پانی پانی ہوتی رہی۔

■❖■

چاند مدھم ہے

چاند نے جب بادلوں کے دبیز پردے سے باہر جھانکا تو رات کافی ڈھل چکی تھی ـــــ گاؤں کے زمیندار بابو ہرنام سنگھ کی پروقار حویلی پر پرسکون فضا کا راج تھا۔ ان کا کمرۂ خاص کی کھڑکیوں کی رنگین پردوں سے دھیمی دھیمی روشنی چھن چھن کر باہر پھولوں کے کنج پر پڑرہی تھی۔ پھولوں میں اس روشنی نے ایک نیا حسن بخش دیا تھا۔ سارے ماحول پر پراسرار خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بابو ہرنام سنگھ کی بارعب شخصیت کی چھاپ ہر شے پر مسلط تھی۔

بابو ہرنام سنگھ کی آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے۔ ان کے قدموں پر گرا ہوا ایک مجبور سا انسان زاروقطار رورہا تھا۔ اس کی سسکیوں سے سارا ماحول دردناک ہوتا جارہا تھا۔ بابو ہرنام سنگھ نے اسے اپنے قدموں سے ایک زوردار ٹھوکر مار کر دور پھینکتے ہوئے بڑے بے رحم انداز میں کہا ـــــ ''کمینے ـــــ! مکاری کرنے آیا ہے۔ اگر میں تیرے آڑے وقت کام نہ آتا تو آج اس گاؤں میں تیرا کہیں بھی ٹھکانا نہیں ہوتا۔ تیری زمین نہیں ہوتیں اور آج تو در بہ در کی ٹھوکریں کھاتا پھرتا۔''

جواب میں وہ صرف رورہا تھا۔ بابو ہرنام سنگھ بپھرے ہوئے شیر کی مانند دھاڑ رہے تھے ـــــ

"دور ہو جا میری نگاہوں کے سامنے سے——! میں تیری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔ تو نے مجھے خوب بے وقوف بنا کر اپنا الو سیدھا کیا ہے——!"

بابو ہرنام سنگھ کے کمرۂ خاص کے دروازہ پر لٹکے ہوئے ریشمی پردے کے قریب ان کا خاص اردلی راموان کے بہت ہی بے تکلف دوست گوبند بابو سے بڑے رازدارانہ انداز میں تفصیل بتا رہا تھا——

"گوبند بابو—— آج مالک کا پارہ بہت گرم ہے۔ وہ آج کالی چرن پر بہت ہی اکھڑے ہوئے ہیں۔ پارسال کے میلے میں جب کالی چرن مالک کو سلامی دینے آیا تھا تو وہ اپنی چھوکریا چھبیلی کو بھی ساتھ لایا تھا۔ مالک نے اسے دیکھا تو بھلا صبر کیسے کر جاتے۔ وہ لنگڑی ماری کہ کالی چرن چاروں شانے چت گر گیا۔ اور اپنی زمین کے بچانے کے لیے جب مالک کے پاس آکر گڑگڑایا تو مالک نے لگام بالکل ڈھیلی کر دی۔ مگر کالی چرن بڑا ہی سیانہ نکلا۔ اس نے مالک کی ہوس کاریوں کی آگ میں اپنی بیٹی کی عصمت کو ظاہراً جھونک تو دیا مگر مالک اسے حاصل نہ کر سکے۔ کالی چرن کی مرضی سے مالک کے بڑے لڑکے وکرم اس چھبیلی کی بچی کو لے کر کہیں غائب ہو گئے ہیں—— مالک تو نہ جانے کیا کر بیٹھیں گے—— بھلا یہ کیسا زمانہ آن لگا ہے—— رام رام رام —— چاند کی کرنیں مدھم ہو گئیں——————

چاند جب نمودار ہوا تو گرمیوں کی شفاف فضا میں چاندنی مچل مچل اٹھی——

قحط اور خشک سالی زدہ علاقوں سے جیسے زندگی روٹھ گئی تھی۔ ان علاقوں میں جہاں پہاڑوں کی ڈھلوانیں اور کھیتوں کے لامتناہی سلسلے سرسبز و شاداب نظر آتے تھے جہاں بہاروں کا ہی راج تھا، آج وہاں سے گویا بہار روٹھ گئی تھی۔ دھرتی کی چھاتی سے جو پانی کی امرت دھار بہتی تھی۔ اس طرح خشک ہو گئی تھی جیسے عرب کے ریگستان ہوں۔

پہاڑی آبادی میں اب وہ رنگ ونور کی بارات نہیں سجتی تھی۔ سنگیت کا وہ راگ پھیکا پڑ گیا تھا جس کی ہر راگنی میں مست مست جوانیوں کے پائل کی جھنکار ہوا کرتی تھی۔ پہاڑی ہرنی جیسی جوانیاں، جہاں نوجوانوں کے مچھلی ابھرے ہوئے بازوؤں کی بھرپور چوٹ مردنگ پر پڑتے ہی، تھرک تھرک اٹھتی تھیں الہڑ پہاڑی حسینائیں بازو میں بازو ڈالے نصف دائرہ بنا کر جب لہراتیں تو ایسا معلوم ہوتا سمندر کی بے تاب لہریں ساحل سے ٹکرا کر چکنا چور ہو جانا چاہتی ہوں۔ ماحول کا ذرہ ذرہ ان کے مست رقص پر رقصاں ہوتا تھا۔ سارا ماحول ناچتا گاتا معلوم ہوتا تھا۔

مگر آج اس کیف و مستی کا کہیں نام ونشان تک نہیں تھا۔ آج پو پھٹنے کے پہلے گاؤں میں کوئی حرکت نہیں تھی۔ نہ مویشیوں کے ریوڑ ہی نکلے اور نہ کوئی کسان ہل اور بیل کو ہانکتا، مچلتا، اٹھلاتا کھیت کی طرف ہی شان سے جاتا۔ صرف خاموش پہاڑی عورتوں کا ہی ایک خاموش قافلہ قطار باندھے سروں پر مٹی کے گھڑے رکھے خاموشی سے پہاڑی بلندی سے نیچے سرکتا ہوتا۔ اس قافلہ کو تلاش تھی صرف پانی کی —— پانی کے لیے گاؤں گاؤں دور کی پہاڑی عورتیں اس چشمے پر اکٹھا ہوتی تھیں جہاں تھوڑا تھوڑا پانی رس رس کر ابلتا تھا۔ گھنٹوں میں ایک ایک قطرہ کر کے کہیں گاگر بھر پاتی۔ آج کا انسان کتنا بھوکا، کتنا پیاسا ہو گیا تھا۔ دھرتی ماتا بھی اس سے اپنی ممتا چھیننے کے درپے ہوگئی تھی۔ ساری آبادی پر غم کا ایک گہرا بادل چھایا ہوا تھا۔ کسانوں کے رہے سہے حوصلے پست ہو گئے تھے۔ دھرتی کی چھاتی پھٹ گئی تھی۔ پانی کا نام ونشان تک نہیں تھا۔ برسات بنا بادل اٹھے گزرتی جا رہی تھی۔

ایک قیامت تھی جو سارے عالم پر بپا تھی۔ ہر آدمی پریشان تھا۔ امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی تھی۔ سرکاری عملہ جب کبھی اس طرف نکل آتا، گاؤں میں خوشی کی لہر

دوڑ جاتی۔ لوگ بے صبری سے ان کی طرف دوڑ پڑتے، جیسے وہ زندگی بانٹنے آ گئے ہوں۔ گل اندازی کے روزگار کھلتے، تقاوی قرض ملتی، راشن کا انتظام ہوتا، لاچار اور مجبور کو مفت غلے تقسیم ہوتے۔ اسکولوں میں کھانا بنٹتا، پانی کے لیے کچے کنواں بنانے کے لیے امداد ملتی۔ لوگوں میں ڈھارس بندھ جاتی۔ جب گاؤں میں سرکاری کیمپ کا پڑاؤ پڑا تو رات گئے تک باغیچہ میں چہل پہل رہی۔ گاؤں کے چودھری کیشو چاچا کو جب قرض ملنے کی باری آئی تو انھوں بڑے گرج کے ساتھ صاف کہہ دیا——

''مجھے ایسے قرض کی ضرورت نہیں۔ میں سارا گاؤں سرکار کو گروی نہیں رکھنے دوں گا اور اس بے ایمان حاکم کے ہاتھوں میں سو روپیہ پر دستخط کر کے نوے روپیہ تو ہرگز نہیں لوں گا۔ یہ سراسر انیائے ہو رہا ہے————!!''

اُن کی آواز پر سارا گاؤں ایک آواز ہو کر بول اٹھا۔ سرکاری کیمپ پر لرزہ طاری ہو گیا۔ دوسرے امن پسندوں نے بیچ بچاؤ کر کے معاملے کو سلجھایا۔

مگر جب دوسرے دن رات کے کسی سناٹے پہر میں خاموشی سے کیمپ اٹھایا جانے لگا تو چاند نے گاؤں کی گوری رادھا کے مسلے ہوئے پھول کی مانند پژمردہ جسم ایک کونے میں پڑا دیکھا۔ وہ سسک سسک کر رو رہی تھی اور سارا عالم سوگوار تھا۔ ایک درندہ شکل انسان نشے میں دھت وہیں کھڑا لڑکھڑا رہا تھا———— چاند کی کرنیں پھر ماند پڑنے لگیں————

چاند نے جب پھر آنکھیں کھولیں تو تاریکی چھٹ چکی تھی————

نیفا کا سرحدی مورچہ برف پوش پہاڑوں میں بھی چوکنا تھا۔ یہ آخری کیمپ دشمنوں کی چوکی سے کوئی سو گز کے فاصلے پر تھا۔ یہی کیمپ سب سے دشوار گزار راہوں کو طے کر کے خفیہ طور پر بنایا گیا تھا۔ ان میں تعینات جوانوں کے دلوں میں صرف

وطن کی آبرو کو برقرار رکھنے کی خواہش کا دریا ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ انھیں دنیا و مافیہا کی کوئی خبر نہیں تھی۔ دنیا کے تمام رشتے ناطے ان جذبوں کی نظر ہو چکے تھے۔ کیمپ میں دھیمی دھیمی روشنی ہو رہی تھی۔ جس سے زندگی کے آثار نمایاں تھے۔ سرحد کے اونچے نیچے ٹیلے، برف پوش وادیاں اور درختوں پر چاند کی جب مدھم سی روشنی پڑ جاتی تو ایسا گمان ہوتا تھا، وطن کے جانباز جوان ہر طرف حفاظت کے لیے کھڑے ہیں۔ ذرے ذرے میں بیداری تھی۔ ایک ذرا سی آہٹ پر جوانوں کی رائفلیں دشمنوں کا رخ کر لیتی تھیں اور ان کے دہانے آگ اگلنے کے لیے بے تاب ہو اٹھتے تھے۔

دوسرا کیمپ سرحد کے شروع کے علاقہ میں نسب کیا گیا تھا۔ یہ شہری علاقہ سے بالکل قریب تھا۔ اس کیمپ میں تعینات جوانوں میں بھر پور زندگی تھی۔ دشمنوں کے حملہ کے خوف و ہراس کی لہر اس کیمپ کو نہیں چھو پائی تھی۔ یہاں جوان دلوں کی دھڑکنوں پر رقص و سرود کی محفلیں گرما گرم تھیں۔ جام و مینا کا ارغوانی دور اپنے پورے شباب پر ہوتا تھا۔

چاند نے دنوں کیمپوں میں جدا جدا زندگی کی لہریں پائیں۔ ایک میں وفاداری، ایثار اور فرض کی کشاکش تھی تو دوسرے میں عیش و عشرت سے لبریز اٹھلاتی، بل کھاتی، پہاڑی ناگن جیسی مست خرام زندگی کی خوشبو ـــــــــ!!

چاند کے دیکھتے دیکھتے زندگی سے بھر پور کیمپ میں موت جیسی خاموشی چھا گئی جوانوں کی اکھڑی اکھڑی سانسوں میں کیف و مستی سے لبریز شراب کی بو رچی بسی تھی۔ اُن کے قدم کسی مغربی دھن پر Twist کرتے کرتے، تھکے ماندے ہو چکے تھے اور سبھی تقریباً نڈھال فرش پر جا لگے تھے۔ کیمپ کے شمالی کونے میں جہاں بٹالین کا انچارج ریشم سنگھ اپنی پوری طاقت سے حسن کی ملکہ سندھیا کو اپنی باہوں میں جکڑے نشہ میں دھت کپڑا

کھڑا لڑکھڑا رہا تھا وہاں دوسرے جوانوں کی للچائی نگاہیں پہنچ پہنچ کر لوٹ رہی تھیں۔ سب کو انتظار تھا کہ انھیں کب اس حسن سے کھیلنے کا موقع ملے۔ اس مقام پر فرض اور وطن پرستی کا لمبا لبادہ سبھی جوانوں کے تن و من سے کوسوں دور تھا۔ ان تمام جوانوں کی آنکھوں میں جنسی ہوس کی سرخ سرخ چنگاریاں سلگ رہی تھیں جس میں وطن پرستی اور جذبۂ ایثار جل بھن کر خاکستر ہو گئے تھے۔ ان کے اعصاب پر ابلیسیت بری طرح سوار تھی۔ سب وحشی درندے معلوم ہو رہے تھے۔

چاند کی مدھر کرنوں نے اس نظارہ سے لجا کر اپنی پاکیزگی کا دامن بچالیا۔ اور چاند پھر مدھم ہو اٹھا ــــــــــــ!

■❖■

سب سے بڑی خوشی

بڑی اماں ایک لمبی مدت کے بعد پاکستان سے آرہی تھیں۔

اس مژدۂ جانفزا نے میرے خاندان کے تمام لوگوں میں خوشی کی ایک لہر سی دوڑادی تھی۔ بڑی اماں کی شخصیت ہی کچھ ایسی تھی۔ مجھے تو ان کی کچھ زیادہ باتیں یاد نہیں ہیں صرف ایک دھندلا دھندلا سا ان کے خدوخال کا عکس ذہن میں محفوظ ہے۔ لمبا قد، گورا چٹا رنگ، متوازن بدن، خوبصورت سا چہرہ اور پان سے رنگے لال لال دانت جو اُن کی مسکراہٹ کی خاص کشش تھے۔ ان کی ہنسی میں ایک خاص قسم کی کھنک تھی۔ بڑے ابا ان دنوں ڈھاکہ میں ریلوے کے ملازم تھے۔ وہ بھی دو تین مہینوں کے وقفہ کے بعد ہی آتے تھے۔ جب وہ آتے تو ہم بچوں کی گویا عید ہوتی تھی۔ وہ طرح طرح کے موسمی پھل، میوے، مٹھائیاں اور کھلونے لاتے تھے اور جتنے دنوں یہاں رہتے ہم سب بچوں کو اپنے ساتھ سیر سپاٹے بھی خوب کراتے تھے۔ بڑا مزہ آتا تھا۔ ان کی واپسی کے دن ہم بچے بہت اداس اداس رہتے۔ بچوں میں سب سے بڑے اشرف بھائی جان تھے نو سال کے، ان کے بعد میں تھا سات سال کا۔ باقی گڈو، ساجدہ اور منی ہم دونوں سے چھوٹی تھیں۔ منّی میری سگی بہن تھی۔ اشرف بھائی جان، گڈو اور ساجدہ بڑے ابا کے بچے تھے لیکن ہمارے مشترکہ خاندان میں سب سگے بھائی بہن جیسے تھے۔ کسی بھی بچے کی ذرہ برابر بھی طبیعت خراب ہوتی سارا گھر ہی بیمار دکھائی دینے لگتا۔ کوئی حکیم صاحب کے

یہاں جارہا ہے، کوئی مولوی صاحب سے پانی دم کرا رہا ہے۔ میری اماں تو جیسے چارپائی سے چپک جاتیں۔ ان کی تیمارداری میرے خاندان میں ضرب المثل تھی۔ بیمار بچے کی نبض ان کے ہاتھوں میں رہتی۔ بخار زیادہ ہوا تو پیشانی پہ بکری کے دودھ کی پٹی چڑھائی جارہی ہے۔ قے ہوئی تو سونف کا شربت دیا جارہا ہے۔ ہر ہر قدم پہ گھریلو نسخے آزمائے جارہے ہیں۔ بارلی دو، گلوکوز دو، یہ دو، یہ نہ دو، گھر میں ایک ہنگامہ برپا رہتا۔ گھر کے تمام معمولات اس سے اثر انداز ہوجاتے۔ کوئی بیمار پڑتا تو بچوں کو بڑی آزادی میسر ہوجاتی۔ کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں ہوتا۔ کب پڑھنے گئے، کب کھیلا، کس کے ساتھ کھیلا، کپڑے اور ہاتھ پیر گندے ہوئے تو کیسے، جیسے سوالات سے نجات ملی رہتی۔ اماں مریض کے ساتھ مریض بن جاتیں اور بڑی اماں ایم. اسلم کے کسی ناول کے مطالعہ میں غرق رہتیں۔ انھیں اس کی قطعی فکر نہ رہتی کہ کون بچہ بیمار ہے اور کون اسکول گیا یا نہیں۔ ہاں، کبھی کبھی مولوی غلام رسول صاحب کی شکایت آنے پر بچوں کی آفت ضرور آجاتی۔ وہ بید کی پتلی کھچی نکالتیں اور شڑاک شڑاک جڑ دیتیں۔ وہ ہمیشہ بچوں میں ڈسپلن کی خواہاں تھیں۔ کیا مجال ان کے کمرے میں کوئی گیا اور ان کی رکھی ہوئی چیزوں کی ترتیب میں خلل ڈالا۔ وہ ایسی کھا جانے والی نظروں سے دیکھتیں کہ خدا کی پناہ۔ ان کی سلیقگی اور نفاست کا یہ عالم تھا کہ ان کے بستر کی چادر پر کبھی شکن نہیں دیکھی گئی۔ ان کا لباس ہمیشہ دھلا دھلا سا صاف وشفاف رہتا تھا۔ وہ گھر کے تمام بچوں کو بھی اپنے جیسے طور طریقے اور ڈسپلن سکھاتی رہتی تھیں۔ ہم تمام بچے اماں سے ساری ناز برداریاں کرالیتے تھے مگر بڑی اماں کے سامنے بھیگی بلّی بنے رہتے۔ بڑی اماں کا رویہ ہم بچوں کے لیے ظاہراً جتنا سخت تھا باطناً اتنا ہی نرم۔ ان کا موڈ جب ہم بچوں سے پیار کرنے کا ہوتا تو وہ اپنے رویوں میں کوئی تبدیلی تو نہ لاتیں تو مگر ایک ایک بچے کو باری باری اپنے کمرے میں لے جاتیں اور کسی ایک ہدایت کے ساتھ کبھی مٹھائی، کبھی کھلونا اور کبھی گھر کی بنی ہوئی کوئی ڈش ضرور دیتیں۔ ہم تمام بچے ان کی ہدایت پر عمل پیرا رہنے کی کوشش کرتے۔

میرے ابا کلکتہ میں اپنا بزنس کررہے تھے۔ بڑے ابا جب چند مہینوں کے بعد ڈھاکہ سے آئے تو اپنے بچوں کو شامل لے جانے کی منادی کردی۔ میرے ابا وجود یکہ بزنس کررہے تھے ہم سب کو اپنے شامل کلکتہ لے جانے کے favour میں نہیں تھے۔ انھیں کلکتہ جیسے بڑے صنعتی شہر کی مصروف زندگی قطعی پسند نہیں تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ ہم سب اپنے ہی ماحول اور اپنے ہی معاشرے میں رہ کر پرورش پائیں۔

سن ۱۹۴۶ء کے اوائل میں جب بڑے ابا ڈھاکہ سے آئے تو اس بار وہ اپنی فیملی کو ابا کی مخالفت کے باوجود اپنے شامل لے گئے۔ ان کا موقف تھا کہ ملک میں آزادی کی تحریک زور پکڑ رہی ہے۔ کوئی جگہ محفوظ نہیں ہے۔ اس لیے ڈھاکہ سے بار بار آنا جانا safe نہیں ہے۔ بڑے ابا کی اس دلیل سے ہم سب متفق ہو گئے اور ہمارا بھرا پرا خاندان دو حصوں میں بٹ گیا۔ جس دن بڑے ابا اپنے خاندان کو اپنے شامل لے جانے لگے میرے ابا نے بھی ہم لوگوں کو اپنے شامل کلکتہ لے جانے کا فیصلہ کرلیا اور خاندانی مکان مقفل کردیا گیا۔ ہم ایک ساتھ کلکتہ تک گئے اور پھر بڑے ابا اپنے بچوں کے ساتھ ڈھاکہ کے لیے روانہ ہو گئے۔

وہ دن ہمارے لیے قیامت کا دن تھا۔

ہم نے ڈبڈبائی آنکھوں اور ڈوبتے دلوں سے بڑے ابا، بڑی اماں، اشرف بھائی جان، گڈو اور ساجدہ کو الوداع کہا۔ ان کے جاتے وقت میرے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا۔ ایسا لگتا تھا کلیجہ منہ کو آ گیا ہے۔ الفاظ حلق میں اٹک سے گئے ہیں۔ بڑی اماں کا بھی روتے روتے برا حال تھا۔ ان کی لازوال محبت دراصل اسی دن ہم پر منکشف ہوئی۔ کئی دنوں تک ہم بھائی، بہنوں پر سکتہ سا طاری رہا۔ نہ کھانا اچھا لگتا تھا اور نہ باتیں کرنا۔ ایک عجیب سی کیفیت ہو گئی تھی ہماری۔

کلکتہ کی فضا بھی مسموم ہو رہی تھی۔ جگہ جگہ سے ہندو مسلم دنگوں کی خبریں آنے لگی تھیں۔ پنجاب جل رہا تھا، دہلی اجڑ رہی تھی، بنگال بھی جلنے لگا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ

نہیں آتا تھا کہ آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ اکثر کلکتہ کی سڑکوں پر بھگدڑ مچتی، ٹرامیں جلائی جاتیں، کھولیاں ویران کردی جاتیں، سڑکوں پر پولیس کی گاڑیاں دندناتی رہتیں، راتوں میں لوگوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں آتیں، دھماکے ہوتے پھر سکوت طاری ہوجاتا۔ یہ سلسلہ کئی مہینوں تک چلتا رہا۔ آخر میں ملک آزاد ہوجانے کی خوشیاں منائی جانے لگیں۔ ملک آزاد ہونے کا مفہوم آج تک میری سمجھ میں قطعی نہیں آیا۔ ہاں، یہ ضرور سمجھ میں آیا کہ بڑی اماں ہمارے پاس اب آسانی سے نہیں آسکتیں کیوں کہ وہ اب دوسرے ملک کی شہری ہوگئی ہیں۔ اس بات نے مجھے بہت ہی افسردہ کیا۔

وقت گزرتا گیا............

پڑوس میں ایک خونی انقلاب بھی آیا اور سر سے گزر گیا۔ جس نے بڑے ابا کے خوابوں کے شیرازہ کو بکھیر دیا۔ وہ بڑے بے سروسامانی کی حالت میں ڈھاکہ سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔ بڑی مشکلوں سے وہ دشوار گزار راہوں سے کراچی پہنچے اور ایک مہاجرانہ زندگی بسر کرنے لگے۔ یہ زمانہ اس خاندان پر بڑا ہی ظالم ثابت ہوا۔ بڑے ابا اس کے صدمہ کو برداشت نہ کرسکے اور اللہ کو پیارے ہوگئے۔ بڑی اماں نے بڑے ہی صبر کے ساتھ تمام مشکلات کا تن تنہا مقابلہ کیا اور اپنے بچوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کردیا۔ اشرف بھائی جان ایک اچھے ڈاکٹر بن کر امریکہ چلے گئے۔ گڈو نے انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی اور جرمنی میں ملازمت کرنے لگا۔ ساجدہ بھی ڈاکٹر بنی اور اس کی شادی کراچی کے ایک اچھے خاندان میں ہوئی۔ اس کا شوہر بھی ایک ڈاکٹر ہے اور دونوں لندن میں مقیم ہیں۔ انھیں صرف تصویروں میں دیکھتا رہا۔ ان پر گزرتے بے ہنگم سے لیل ونہار کی گرمی ہم بھی محسوس کرتے رہے مگر کر بھی کیا سکتے تھے۔ بچپن کی معصومیت نہ رہی، زمانے کے اتار چڑھاؤ سمجھ میں آنے لگے۔ میں نے ڈی یو سے ایم بی اے کیا اور شارجہ میں ملازمت کرنے لگا۔ بڑی اماں ہر سال انڈیا آتیں اور اپنی محبتوں کی تجدید کرتی رہتیں، لیکن میری بدقسمتی کہ ان سے ملاقات کبھی نہ ہوئی۔ وہ جب بھی انڈیا آتیں تمام قریبی رشتہ داروں اور عزیزوں سے ملنے ضرور جاتیں۔ وہی پرانی یادیں ان کے جینے کا سہارا بنی ہوئی تھیں۔ ان

کی آمد کی اس بار کی خبر سے مجھے دلی مسرت ہوئی تھی کیوں کہ میں ان سے تقریباً بیس برسوں کے بعد ملوں گا۔ ایک عجیب سا احساس دل و دماغ پر چھا رہا تھا۔ بچپن میں بڑی اماں کی شخصیت کا بنا ہوا امیج میرے دل و دماغ میں ابھی تک ویسا ہی محفوظ تھا۔ ابھی بھی ان کی کھا جانے والی آنکھیں مجھے صاف نظر آ رہی تھیں۔ بچوں میں حد درجہ ڈسپلن کی قائل، بڑی اماں سے برسوں بعد ملنے کے احساس نے مجھے قدرے بے چین بھی کر دیا تھا۔

خدا خدا کر کے وہ گھڑی آن پہنچی جب میں انھیں ریسیو کرنے ائیر پورٹ پر موجود تھا۔ طیارہ ایک شانِ بے نیازی سے رَن وے پر دوڑا اور میرے دل کی دھڑکنوں کو تیز کرتا گیا۔ چند لمحوں بعد ہی بڑی اماں کا سراپا میرے سامنے تھا۔ وہی چہرہ، وہی مسکراہٹ اور وہی بارعب شخصیت۔ فرق صرف اتنا تھا کہ خوبصورت چہرے کے ورق پر وقت نے اپنی تاریخ لکھ ڈالی تھی اور حالات کے بوجھ نے کمر خمیدہ کر دی تھی ورنہ آج بھی آواز میں وہی کھنک، وہی گرج موجود تھی۔ میں انھیں دیکھ کر آبدیدہ ہو گیا۔ انھوں نے تھوڑے توقف کے بعد مجھے پہچانا اور اپنی بانہیں پھیلا دیں۔

''میرا بچہ......''

''بڑی اماں......''

''میں تو تجھے پہچان بھی نہ سکی......''

''جی......ایک مدت کے بعد جو دیکھ رہی ہیں، کیسی ہیں آپ؟''

''بس تمہارے سامنے ہوں۔''

گھر تک کے راستے میں ڈھیر ساری باتیں کرتی رہیں اور گھر پہنچ کر تو گویا وہ بالکل کھل اٹھی تھیں۔ گھر آج بالکل بدلا بدلا سا نظر آ رہا تھا۔

بڑی اماں نے اپنے پروگرام کے مطابق تمام رشتہ داروں سے ان کے یہاں جا جا کر ملاقاتیں کیں۔ اتنا زیادہ ٹرین، بس اور دیگر سواریوں سے سفر کرنے کے باوجود ان کے چہرے پر تکان کے بجائے بے حد بشاشت تھی۔ وہ بے تکان سفر کرتی رہیں۔ جیسے جیسے ان کی واپسی کے دن قریب آنے لگے ان کے چہرے پر تکان کے اثرات

نمایاں ہونے لگے۔ وہ بجھی بجھی سی رہنے لگیں۔ میں ان کی یہ کیفیت دیکھ کر ایک دن ان سے پوچھ بیٹھا: ''بڑی اماں! آپ انڈیا آکر کیسا محسوس کرتی ہیں؟''

انھوں نے مجھے بہت غور سے دیکھا اور بولیں: ''سچ بتاؤں؟ دیکھو یہ ملک مجھے بے حد عزیز ہے۔ میں اسی سرزمین کی مٹی کی پیداوار ہوں۔ میں دنیا کے کسی بھی خطے میں چلی جاؤں، وہاں بس کیوں نہ جاؤں، مگر یہاں کی مٹی کی آواز مجھے صاف سنائی دیتی ہے۔ میرے تمام اپنے یہاں ہیں، ان کے دلوں کے رشتے میں بھلا کیسے توڑ سکوں گی۔ یہ تقسیم ہی غلط ہوئی ہے۔ ملک کو برطانوی حکومت کے شکنجے سے آزاد کرانے کے لیے جو ایک عظیم لڑائی لڑی گئی وہ ہندوستانیوں نے لڑی تھی، نہ ہندوؤں نے، نہ مسلمانوں نے۔ ملک تو آزاد ہوا مگر سیاسی جادوگروں نے ہندو مسلم اتحاد کو بڑی چالاکی سے ملیامیٹ کر دیا اور آپسی بھائی چارگی، انسان دوستی، ہمدردی اور ایثار جیسے تمام صادق جذبوں کو جلا کر راکھ کر دیا اور اسی راکھ کو آپس میں بانٹ بھی لیا۔ یہ وطن کی تقسیم نہیں بلکہ تمام انسانی قدروں کے ملبوں کی تقسیم تھی اور یہ راکھ جس زمین میں بوئی گئی وہاں عصبیت، فرقہ واریت، نفرت، رشوت ستانی جیسی فصلیں اگیں اور اس طرح دونوں ملک بے سمتی کا شکار ہو گئے۔ نہیں بیٹا، نہیں ...... یہ تو ممکن نہیں ہے کہ میں اپنوں سے رشتہ توڑ لوں۔ میں نے ہجرت کی تھی۔ ایک سنت ادا کی تھی مگر آج میں اپنے اس فیصلہ پر نادم ہوں کہ میں نے سلطنت خداداد کا خاکہ اپنے ذہن میں کیوں بنایا اور اس خوابوں کی دنیا کو پانے کی خواہش کیوں کی۔ ایک لمبی مدت کے بعد بھی میرے لیے اس ملک میں کیا ہے۔ میں تمھیں کیسے یقین دلاؤں بیٹا کہ یہاں آکر مجھے کیا کیا میسر ہوتا ہے۔ سب سے بڑی خوشی تو مجھے اس وقت ہوتی ہے جب انڈیا میں لوگ مجھے پاکستان کہتے ہیں۔ میں تو پاکستان میں رہ کر آج بھی مہاجر ہوں، بہاری ہوں...... وہاں پاکستانی مجھے کوئی نہیں کہتا۔''

بڑی اماں کا گلا رندھ گیا، آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور آواز میں لرزہ طاری ہو گیا۔ میں حیرت سے ان کی طرف دیکھتا رہا۔

■❖■

نادانی

نیل کمل ڈریسرز میں جب دو بڑی بے باک سی لڑکیاں داخل ہوئیں تو اس کا نوجوان خوبرو سیلزمین کمل گھبرا سا گیا۔ اور انھیں بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ لڑکیاں جب اس کے بالکل مدمقابل ہوئیں تو وہ اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے مسکرایا اور کہا: ''آیئے۔۔۔ تشریف لایئے۔۔۔!! میں آپ کی کیا سیوہ کرسکتا ہوں؟'' لڑکیاں صرف مسکراتی رہیں اور دوکان میں سجے ملبوسات کو بڑے انہماک سے دیکھتی رہیں۔

کمل ایک بار پھر ان کی قیامت خیزیوں کا شکار ہوگیا۔ ساری فضا مشکبار ہو اٹھی تھی۔ لڑکیوں کے انگ انگ سے پھوٹنے والی مستیوں کا جادو کمل کے سارے وجود پر مسلط تھا اور وہ خیالات کے ریگزاروں پر پیاسا بھٹک رہا تھا۔ اس نے خود کو ایک بار پھر سنبھالنے کی کوشش کی اور سوچا کہ اس کے یہاں تو اکثر لڑکیاں آتی رہی ہیں مگر ایسی کیفیت تو کبھی نہیں ہوئی تھی، آخر ایسی کون سی بات ان لڑکیوں میں ہے، جو وہ اس قدر محو ہوگیا۔ یہ ایک کامیاب سیلزمین کے کردار کے بالکل خلاف ہے اور اس کا برا اثر بالواسطہ طور پر تجارت پر پڑ سکتا ہے۔

''میں اپنے لیے کچھ ڈریسیز بالکل ماڈرن۔۔۔ چاہتی ہوں۔ میرا جسم آپ کے سامنے ہے اسے اور خوبصورتی دینا چاہتی ہوں۔۔۔'' ایک لڑکی بڑی ناز وادا سے

چِک چِک کر کہتی رہی اور دوسری کمل کی طرف دیکھ کر مسکراتی رہی۔
''جی بہت اچھا ــــ!! مگر ہاں، آپ کچھ تو اپنی پسند بتائیں گی ہی ــــ!؟''
کمل بڑی کوششوں کے بعد اتنا بول سکا۔
''وہ بس یوں سمجھ لیجیے...... اپرادھ میں ممتاز......'' وہ ہر لفظ پر زور دے کر بولتی رہی۔
''اچھا...... سمجھ گیا......!'' کمل نے اس کی پسند کے کپڑے الماری سے نکال کر اس کے سامنے رکھ دیے۔
''میں اسے پہن لوں ــــ؟''
''ہاں ــــ بالکل ــــ!!'' کمل نے ٹرائل روم کا دروازہ وا کرتے ہوئے کہا۔ لڑکی اندر داخل ہوگئی اور دروازہ خود بخود بند ہوکر ڈولتا رہا۔ کبھی اندر، کبھی باہر دوسری لڑکی بڑے اطمینان سے شوکیس میں رکھے سٹیلز کو غور کرتی رہی۔ کمل نے جب اس کی طرف دیکھا تو وہ بڑے تیکھے انداز میں مسکرائی۔ کمل شرما گیا اور بولا ــــ ''آپ کے لیے کیا دوں؟''
''جی ــــ؟ میں تو ابھی فیصلہ نہیں کر پائی ہوں کہ میرے لیے کون سی پوشاک ٹھیک رہے گی!''
''آپ کے لیے، تو ......و......و......!'' وہ سوچنے لگا اور 'تو' کو کھینچتا ہوا اپنی الماریوں کی طرف دیکھنے لگا۔ اتنے میں ٹرائل روم کا دروازہ آدھا کھلا اور اس لڑکی نے جھانک کر کمل کی طرف دیکھا اور دھیرے سے بولی، ذرا سنئے ــــ! پلیز ــــ!!
''جی ــــ!''
''اندر آیئے نا ــــ! ــــ!'' اندر سے آواز آئی۔ کمل نے باہر کی لڑکی کی طرف دیکھا جو اسے دیکھ کر مسکرائی تھی۔ کمل اندر جاتے ہوئے ہچکچایا مگر باہر کی لڑکی نے

کہا: ''جایئے نا۔۔۔!'' اور کمل اندر جا چکا تھا۔

''کہیے۔۔۔؟''

لڑکی نئے لباس میں قیامت ڈھا رہی تھی۔

جی۔۔۔! کہنا یہ ہے کہ گلے میں زِپ کے بجائے ڈورے ہوتے۔۔۔ ہاں ڈورے۔۔۔ ڈورے۔۔۔ تو زیادہ بہتر تھا۔۔۔'' کہتے ہوئے لڑکی نے گلے کی زپ اوپر سے نیچے بالکل کھول دی اور اس کے جسم کے دو گلاب باہر جھانکنے لگے۔ کمل کا حلق سوکھ گیا۔ وہ گھبراتا رہا اور کچھ بول نہ سکا۔ لڑکی اس کے بالکل قریب آ گئی اور عجیب نظروں سے گھورتی رہی، کمل پھر بھی خاموش رہا۔

''میں آپ سے کچھ کہہ رہی ہوں۔۔۔''

''ہاں! میں نے سنا بھی اور دیکھا بھی۔۔۔''

''کیا دیکھا۔۔۔؟'' وہ آگے بڑھی۔

''جی کچھ نہیں۔۔۔!''

لڑکی نے اپنی باہیں کمل کی گردن میں حائل کر دیں اور بڑی سرگوشیوں میں بولی۔۔۔ ''میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔''

''سنو! میں تمھیں اپنے کالج کے دنوں سے جانتی ہوں۔ مگر ظالم تم نے مجھے کبھی کوئی لفٹ نہ دی۔ اگر تو مجھے اپنا نہ سکتا تھا تو کم از کم دو میٹھے بول تو بول سکتا تھا۔''

کمل حیران تھا۔ وہ بولتی رہی۔۔۔ ''میری یہ جوانی آج ایک دولت مند بڑھاپے کے گھر کی شوبھا بنی ہوئی ہے، مگر میں اس قیدی سے رہائی چاہتی ہوں۔ میں تمھیں اب بھی پیار کرتی ہوں۔ میں نے اکثر تمھیں یہاں دیکھا، مگر سوچا کبھی تو تم مجھے اپنی طرف آنے کا ایک ہلکا سا بھی اشارہ کرو گے مگر کٹھور تم نے کبھی کسی کی آرزوؤں کا کوئی خیال نہیں کیا۔''

کمل سناٹے میں پڑا رہا۔ وہ لڑکی اسے بری طرح بھینچ رہی تھی، کمل نے الگ ہونے کی کوشش کی مگر اس کی گرفت مضبوط تھی۔ ''بے رحم ـــــ اتنا ستم نہ کر ـــــ'' کمل بھٹکتا گیا اور اس کا سارا وجود اب لڑکی کے قبضے میں تھا۔

''میں اس بڈھے، کھوسٹ بھیڑیے سے تنگ آ چکی ہوں۔ پلیز کس میں ونس ـــــ'' اور کمل کے ہونٹ اِس میں ڈوب گئے۔

جب کمل الگ ہوا تو لڑکی خاموش کھڑی تھی۔ کمل نے باہر جانا چاہا مگر لڑکی نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور دھیرے دھیرے بولتی رہی ـــــ ''یہ شام یاد رکھنا، میں برابر آؤں گی۔ اگر کبھی اس جانور نے فرصت نہ دی تو مجھے رنگ کر دینا۔ یہ ہے میرا ٹیلی فون نمبر ـــــ''

کمل کے ہاتھ میں ایک کاغذ کا ٹکڑا تھا جس پر خوبصورتی سے ''شرلی'' لکھا ہوا تھا۔

اور دونوں ٹرائل روم سے باہر آ گئے۔

دوسری لڑکی ابھی تک سیٹلز ہی دیکھ رہی تھی۔

دونوں لڑکیوں نے ایک دوسرے کو بڑی معنی خیز مسکراہٹوں کے درمیان دیکھا اور کمل اندر سے پریشان ہو رہا تھا۔ لڑکی نے بڑی محبت سے کاؤنٹر پر جھک کر قیمت ادا کی اور کمل کی طرف پیاری پیاری نظروں سے دیکھتی رہی۔ کمل نے بھی آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے پیار سے دیکھا ـــــ

دونوں لڑکیاں واپس جانے لگیں۔ کمل نے ایک عجیب سی کسک محسوس کی اور ہاتھ ہلا کر انھیں الوداع کہتا رہا۔ اسے محسوس ہوتا رہا جیسے کوئی نہایت قیمتی شئے کھو گئی ہو۔ وہ انھیں دور تک جاتا دیکھتا رہا۔

وہ دیر تک اس چرائے ہوئے لمحے کو اپنے ہونٹوں پر مچلتے ہوئے محسوس کرتا رہا۔

اسے ایک عجیب سی لذت ملتی رہی۔ اور اس کے بدن میں ایک لطیف سی جھرجھری کا احساس کیا جونہایت انوکھااور خوشگوار تھا۔

کمل بڑی دیر تک اپنے آپ میں کھویا رہا۔ وہ اس وقت چونکا جب ایک نوجوان اس کے سامنے کھڑا کچھ طلب کرر ہا تھا۔

کمل نے نوجوان کے ساتھ ڈیل کیا اور کچھ سیل بھی۔ جب اس نوجوان کے دیے ہوئے نوٹوں کو وہ کیش بکس میں رکھنے لگا تو اس کا دماغ ماؤف ہوگیا۔ کیش بکس بالکل خالی تھا۔ اس نے جلدی جلدی تمام خانے الٹ ڈالے مگر آج کی سیل کا کیش غائب تھا۔ آج اس نے غیر معمولی طور پر سیلنگ بھی کی تھی۔ اس پر لرزہ طاری ہونے لگا۔ ان لڑکیوں کے آنے سے قبل کیش بکس میں پچاس ہزار تین سو پچھتر روپے تھے۔ مگر جب وہ ٹرائل روم میں گھسنے لگا تھا، اسے وہ مقفل کرنا بھول گیا تھا، ایک لمحہ میں ساری باتیں سمجھ میں آ گئیں۔ وہ باہر کی لڑکی کا مسکرانا اور ٹرائل روم کا لمحہ سازشوں کا ردِعمل تھا۔

کمل نروس ہوتا چلا گیا۔ دسمبر کی شام ہوتے ہوئے بھی اس کی پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے چمکنے لگے تھے۔ لڑکی کے دیے ہوئے ٹیلی فون نمبر کا یکا یک اسے خیال آیا۔

اس نے نمبر ڈائل کیا اور ماؤتھ پیس ہاتھ میں ہلکا ہلکا تھرتھراتا رہا۔ وہ کاغذ کا ٹکڑا اس کے سامنے لرز رہا تھا۔ اس نے لڑکی کا نام پڑھا...... شرلی...... کمینی...... اس کی آنکھیں غصہ سے سرخ ہوتی رہیں، ادھر سے آواز گونجی...... ہیلو——!'' آواز مردانہ تھی۔

''ہیلو——! کمل اسپیکنگ——!!''

''واٹ——!''

''میں شرلی سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کون صاحب بول رہے ہیں؟''

''میں یہاں کا سپر نٹنڈنٹ وجے کپور ہوں، آپ کسے چاہتے ہیں؟''

''جی ——— شرلی کو ———''

''جی ——— کیا کہا —— ؟ شرلی ——— ؟''

یہاں اس نام کا کوئی پاگل نہیں ——''

اور لائن کٹ ہو گئی۔ مکمل پاگلوں کی طرح ماؤتھ پیس کو آنکھوں کے سامنے لاکر غور سے دیکھتا رہا اور پھر دیکھتے دیکھتے یکا یک زور سے چیخ دیا ——!

■❖■

آندھی

ادھر چند ہفتوں سے روزانہ شام میں فضا بالکل گرد آلود ہو جاتی اور تیز ہوائیں سنسنانے لگتیں۔ کبھی کبھی ہلکی ہلکی بوندا باندی بھی شروع ہو جاتی۔ ایسے موسم میں مجھے غزالی صاحب بری طرح یاد آ جاتے اور میں اپنے کمرے سے نکل کر جلدی جلدی سیڑھیاں طے کر کے ان کے کمرے میں پہنچ جاتا۔ ہر بار کی طرح وہ اپنے کمرے میں نہیں ہوتے۔ میں انھیں اُن کی ذاتی لائبریری میں کتابوں سے بھری الماریوں پر پلاسٹک کی چادریں پھیلانے میں مصروف پاتا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ مجھ سے مخاطب ہوتے——

''جاوید صاحب! کیا کروں، ان کتابوں کو اپنی اولاد کی طرح سنبھال کر رکھا ہے۔ انھیں اس بارش کی بوندوں سے نہ بچاؤں تو ساری کی ساری گل سڑ کر مٹی ہو جائیں گی۔ کب سے انور سے کہہ رہا ہوں ان کھڑکیوں میں پلّے لگوا دے مگر وہ کچھ سن ہی نہیں رہا ہے۔''

میں آگے بڑھ کر اُن کی مدد کرنے لگتا۔ وہ پھر گویا ہوتے—— ''دراصل کتابیں جو آپ یہاں دیکھ رہے ہیں، میرے مطالعہ کے شوق کا نتیجہ ہیں۔ زندگی میں میرا اور کوئی دوسرا شوق کبھی نہیں رہا۔ ظاہر ہے جب مطالعہ کا چسکا لگ گیا تو نئی اشاعت پر بھی نظر رہے گی ہی۔ ایک وقت ایسا بھی تھا جب نئی کتابیں بک سیلرز سے قبل میرے پاس ہوتی تھیں۔''

''جی غزالی صاحب بڑا ہی ستھرا ذوق ہے آپ کا۔ میں تو رشک کرتا ہوں۔''
وہ صرف مسکراتے رہتے۔ غزالی صاحب اپنی عمر کی اس منزل میں ہیں جہاں پورے سکون و آرام کی اشد ضرورت ہوتی ہے، مگر ان کا معاملہ ہی کچھ اور ہے۔ رات دن ذاتی لائبریری میں لگے رہتے ہیں۔ کتابوں پر پڑی گرد صاف کرنا، اُن کی مکرر جلد سازی کرانا، الماریوں پر رنگ و روغن کرانا اور نہ جانے کیا کیا کرتے رہتے ہیں۔ میں جب بھی اُن سے ملنے گیا ہوں انھیں مصروف ہی پایا ہے۔

غزالی صاحب مقامی ہائی اسکول میں اردو زبان کے معلّم تھے۔ ابھی حال ہی میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے ہیں۔ وہ بیک وقت ایک اچھے معلّم، ایک قادرالکلام شاعر، معتبر محقق اور نہایت اخلاق مند، وضع دار اور دردمند دل کے مالک ہیں۔ اب اتنی خوبیاں یکجا کہاں ملتی ہیں۔ ان کی زندگی علم وتہذیب کی اشاعت سے عبارت ہے۔ اپنی جوانی کے ایام میں انھوں نے شہروں شہروں گھوم کر ڈھائی سو سے زائد مرحومین شعراء کے حالاتِ زندگی اور نمونۂ کلام مرتب کیے اور ایک تذکرہ بھی شائع کیا۔ ان کے اس ادبی کارنامے کی زبردست پذیرائی ہوئی۔ یہ تذکرہ تو اب ادب میں Refrence Book کی طرح لیا جارہا ہے۔ غزالی صاحب کے مطابق اس تذکرہ کے لیے مواد اکٹھا کرنے میں ان کی عمر کے پچیس قیمتی سال صرف ہوئے ہیں اور سفر کی صعوبتیں الگ برداشت کرنی پڑی ہیں۔ بہت سی مرحومین شعراء کرام کی تیسری اور چوتھی نسلیں چل رہی ہیں، جنھیں کچھ معلومات نہیں ہیں اور بہت سے ایسے شعراء بھی ہیں جن کی کوئی نسل فی الحال موجود نہیں ہے۔ اُن کے نمونۂ کلام یا حالاتِ زندگی یا تو کسی قومی لائبریری یا خانقاہ کی چوکھٹ سے حاصل ہوسکے ہیں۔ اس کے علاوہ تقریباً ڈھائی سو موجودہ حیات شعراء کا بھی مسودہ تیار ہے مگر وسائل نہیں رہنے کی وجہ سے اشاعت ممکن نہیں ہوسکی ہے۔ اس کی تیاری میں سیکڑوں مجموعۂ کلام اور ہزاروں رسائل کھنگالنے پڑے ہیں۔ یہ بھی ایک بڑا ادبی کارنامہ ہوگا۔ اس کے علاوہ مغلیہ دور کے کچھ معروف شعراء کے کلام پر مشتمل کتاب تصنیف

کر چکے ہیں۔ مغلیہ شہزادوں اور شہزادیوں کی زندگی، ان کے ذوق سے متعلق تقریباً دس رسالے تیار ہیں۔ ان کا اپنا مجموعۂ کلام منظرِ عام پر آچکا ہے۔ اپنے تین معاصر شعراء کے مجموعۂ کلام کی ترتیب و تدوین بھی کر چکے ہیں۔ ان کی اشاعت میں مالی تنگی حائل ہے مگر تاہم حوصلہ سلامت ہے۔ اپنے شہر کے چند معتبر، مخلص اور ہمدردانِ قوم و ملت کے ساتھ مل کر ایک اقلیتی ڈگری کالج کی بنیاد بھی ڈالی اور کالج نے ماشاء اللہ کافی ترقی بھی کی۔ اسے حکومت اور عوام کا یکساں support ملا اور چند ہی برسوں میں اس کالج کا شمار ملک کے اچھے کالجوں میں ہونے لگا۔ اس کالج کے قیام کے لیے غزالی صاحب اور اُن کے ایک گہرے دوست ڈاکٹر محمود نے گاؤں گاؤں کا پیدل دورہ کر کے عوامی تعاون حاصل کیا۔ کتنی راتیں گاؤں والوں کے ساتھ گزاریں۔ ان کی محنت رنگ لائی اور عوامی تعاون سے کالج وجود میں آ گیا۔

غزالی صاحب کی شخصیت میرے لیے پھر بھی پُراسرار بنی رہی۔ میں اکثر سوچتا انھیں اتنی توانائی کہاں سے حاصل ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ کہنے لگے—— ''آپ کو سن کر یہ عجیب سا لگے گا کہ میں نے اسکول کی ملازمت صرف پینتالیس روپے ماہانہ تنخواہ پر شروع کی تھی اور اس وقت بھی اس کی آدھی رقم کتابوں پر صرف کر دیتا تھا۔ خانہ داری میں یقیناً تنگی واقع ہو جاتی تھی مگر اہلیہ نے کوئی گلہ شکوہ کبھی نہیں کیا۔ کہتی تھیں کہ شوق پورا کرنے میں تو لوگوں نے اپنی جاگیریں تک برباد کر ڈالی ہیں۔ یہ آپ کا خرچ کون سا بہت بڑا ہے۔ اللہ ضرور تیں پورا کرنے والا ہے۔ اور بے شک اللہ نے پورا کیا۔ دونوں بیٹوں کو پڑھایا، ان کی شادیاں کیں۔ شہر میں ایک مکان بنایا۔ جب میں نے نوکری کے لیے عرضی دی تھی تو والد صاحب بہت چراغ پا ہوئے تھے۔ کہتے تھے ''میری ساری عزت نیلام ہو گئی۔ میرے خاندان میں کسی نے بھی نوکری نہیں کی ہے۔ نوکر رکھا ہے۔ آخر یہ زمینداری، یہ کھیت کھلیان کس دن کے لیے ہیں۔'' میں خاموش رہا۔ والد صاحب کو کیا پتا تھا کہ ملک میں آزادی حاصل کرنے کا جو جنون تھا اس کا کیا انجام ہوگا۔ زمینداری سب

سے پہلے ہوا ہو جائے گی اور وہی ہوا بھی۔ انھیں بعد میں احساس ہوا کہ میں صحیح تھا۔ اُن کی خفگی زائل ہوگئی۔ میں نے یہ دل میں ٹھان لیا تھا کہ اُن کو اپنی کسی پریشانی کی بھنک بھی نہیں لگنے دوں گا اور کوئی امداد بھی نہیں لوں گا۔ اور میں اپنے اس فیصلے پر بڑی پختگی سے کاربند بھی رہا۔''

میں انھیں بہت انہماک سے سنتا رہا۔ میری نظر میں اُن کا قد اور بلند ہو گیا تھا۔ میں اُن کی بے پناہ قدر کرنے لگا تھا۔ اُن کی کتابیں اور ذاتی لائبریری ہی اکثر ان کی گفتگو کا موضوع ہوا کرتیں۔ ایک مرتبہ کہنے لگے ـــــ ''کیا عرض کروں صاحب! اس لائبریری نے اچھے اچھوں کو میرے سامنے برہنہ کر دیا ہے۔ ایک صاحب، نام نہیں لوں گا، کہنے کو تو اردو ٹیچر ہیں، کالج میں، اُن کی یہ اوچھی حرکت ملاحظہ فرمایئے۔ میرے پاس بڑی کوششوں کے بعد 'طبقات ناصری' کا ایک نسخہ پاکستان سے آیا تھا۔ آپ جانتے ہی ہوں گے یہ کتاب نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے۔ فارسی زبان سے اردو میں منتقل غلام رسول مہر نے کیا۔ میں ایک مدت سے اس کی تلاش میں تھا۔ میرے ایک عزیز کی محبت سے یہ مجھ تک پہنچی۔ وہ صاحب درپے ہو گئے کہ چند دنوں کے لیے دے دیجیے۔ میں نے ایک ذمہ دار شخص سمجھ کر کتاب انھیں دے دی۔ ایک ماہ کے بعد انھوں نے اپنے کسی شاگرد سے کتاب مجھے بھجوادی۔ کتاب کی ضخامت مجھے کم محسوس ہوئی۔ میں نے کتاب کھولی۔ سخت حیرانی ہوئی کہ کتاب کے کچھ اوراق غائب تھے۔ غور کیا تو تقریباً بیس صفحات پھاڑ لیے گئے تھے۔ میں نے اسی شاگرد سے انھیں خبر دی مگر ان کا کوئی جواب نہیں آیا۔ ایک مشاعرہ میں ان سے ملاقات ہوگئی۔ پہلے تو کترائے مگر سامنا جب ہو گیا تو فرمایا: وہ صفحات پہلے سے ہی غائب تھے۔ میں نے بہت مہذب گالیاں دیں، مگر شاید وہ کچھ سمجھ نہ سکے۔ آخر میں میں نے اس کتاب کو انھیں عطیہ کر دینے کی بات کہی تو بہت شرمندہ ہوئے۔ مگر پھر بھی اپنے جرم کا اعتراف نہیں کیا۔ ایسے شریفوں کی بہت ساری ذلیل حرکتیں میرے تجربہ میں آئی ہیں۔ ایک اور صاحب میرے اچھے ملنے والوں میں

تھے۔ ایک روز تشریف لائے اور فرمایا کہ چھوٹی بیٹی پی ایچ ڈی کے لیے مقالہ تیار کر رہی ہے مگر دشواری یہ ہے کہ اس کے سبجیکٹ کی مناسب کتابیں نہیں مل رہی ہیں۔ میں نے ازراہِ ہمدردی سبجیکٹ پوچھ لیا۔ کہنے لگے—— ''مولانا آزاد اور اردو صحافت'' میں خاموش رہا۔ ایک روز اپنی بیٹی کے ساتھ نازل ہو گئے۔ لائبریری میں دونوں گھس گئے اور بیس کتابیں نکال کر لے گئے، اس وعدہ پر کہ مقالہ مکمل ہو جانے پر واپس کر دیں گے۔ مقالہ داخل ہوا، ڈگری اِوارڈ ہوگئی، بیٹی کسی کالج میں لکچرار بھی ہوگئی، مگر آج تک نہ وہ آئے اور نہ میری کتابیں۔ ایک اور نوجوان ہیں۔ علی گڑھ سے اردو میں ایم اے کر رہے ہیں۔ میرے پاس اکثر آیا کرتے ہیں۔ ابھی حال کی بات ہے۔ ایک شام آئے اور بڑے لق لقے سے علی گڑھ کے ادبی ماحول پر گفتگو کی۔ میں کسی حاجت سے نیچے اترا۔ تھوڑے ہی توقف کے بعد آیا تو انھیں لائبریری میں پایا۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگے نہایت اچھا کتابوں کا collection ہے۔ جی خوش ہوگیا۔ اگلی بار آؤں گا تو آپ کی پسند کی کچھ کتابیں لیتا آؤں گا، اور آپ کی نذر کروں گا۔ میں مسکرانے لگا۔ وہ تھوڑی دیر کے بعد چلے گئے۔ اُن کے اس طرح جلد چلے جانے پر مجھے شک ہوا۔ الماری چیک کی تو ایک کتاب کی جگہ خالی پائی۔ کتابوں کے کٹیلاگ سے ملایا تو شاکر پروین کی کلیات ''ماہ تمام'' غائب تھی۔ میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔''

غزالی صاحب نے جیسے انکشافات کیے وہ white collared لوگوں سے نفرت کرنے کے لیے کافی تھے۔ میں نے ان کا دل رکھنے کے لیے کہا—— ''شکر کیجیے کہ آپ نے خود دیکھ لیا ورنہ شک کے دائرے میں نہ جانے کیسے کیسے لوگ آجاتے۔ اس طرح لوگوں کے اصلی چہرے تو آپ کے سامنے بے نقاب ہوگئے ہیں۔''

''اجی صاحب! آپ کیا جانیں میری کیسے گاڑھے پسینے کی کمائی ان کتابوں میں لگی ہے۔ کتابوں کی اس طرح بے حرمتی سے میری روح تڑپ جاتی ہے۔''

''وہ تو ہے——''

''ایک نالائق میرا شاگرد خیر سے مرکز میں وزیر بن گیا ہے۔ جب شہر میں ہوتا ہے تو مجھ سے ملنا نہیں بھولتا۔ ہر ملاقات میں کہتا ہے سرکار سے زمین حاصل کر کے آپ کی شاندار لائبریری سرکاری امداد سے بنوادوں گا۔ وہ کم بخت مجھ سے بھی سیاسی گفتگو ہی کرتا ہے۔''

''آپ نے تو دنیا دیکھی ہے، ایسی باتوں کو خوب سمجھتے ہوں گے۔''

''یہ سب لوگ جانتے ہیں کہ یہ کتابیں میری زندگی کا ایک حصہ بن گئی ہیں۔ میرا کتابوں کا جنون اس درجہ ہے کہ اگر کوئی کتاب مجھے نہ مل سکی تو میں نے اپنے عزیزوں، احباب کو زحمت دے کر وہ کتاب کلکتہ، بمبئی یا حیدرآباد سے زیروکس کرا کر حاصل کر لی ہے۔ مجھے اس بات کا بھی بہت بڑا صدمہ ہے کہ انور میاں کو ان کتابوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ کبھی ایک رسالہ تک نہیں پڑھتے۔ میرے ان کتابوں کے شوق کو قطعی ناپسند کرتے ہیں۔''

''نہیں —— نہیں —— ایسا کچھ نہیں ہے۔''

''آپ نہیں جانتے وہ میرے مرنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ ابھی سے ہی ایک کباڑی سے کتابوں کا دو روپے کلو کے حساب سے سودا بھی کر چکے ہیں۔ آپ دیکھئے گا ایسا ہی ہوگا۔ میں اپنی بدقسمتی کا ماتم کرتا ہوں۔ ایک میرے بہی خواہ نے مشورہ دیا کہ اردو اکادمی سے رجوع کیجیے۔ لائبریری کے لیے مالی امداد ملتی ہے۔ میں شامت کا مارا ہوا سکریٹری کے پاس چلا گیا۔ انھوں نے فرمایا: یہاں سے نکلنے والا جریدہ لائبریری کے لیے جاری ہوسکتا ہے بشرطیکہ آپ اپنے علاقہ کی اردو آبادی کے اعداد و شمار بتائیں۔ میں نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا کہ جناب یہ ذمہ داری تو اکادمی کی بنتی ہے کہ وہ ہر علاقے کا اس طرح کا سروے کرائے اس کے بعد اردو زبان کو زندہ رکھنے کے لیے اقدام کرے۔ اردو کی ترویج و اشاعت کا ہی مقصد ان اکادمیوں کا ہے نہ کہ مشاعرے، سیمینارز اور افطار پارٹیاں کر کے سرکاری گرانٹ کو ضائع کرنا۔ آپ معروف شعراء و ادباء

کے مجموعوں کی اشاعت کے لیے مالی تعاون کرتے ہیں، انعامات تقسیم کرتے ہیں۔ میں اکادمیوں سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ جب اردو پڑھنے والے ہی ناپید ہو جائیں گے تو ان کتابوں کو کون پڑھے گا۔ آپ نے اردو کی بنیادی تعلیم کا کیا انتظام کیا ہے۔ اتنا سن کر انھوں نے جھلا کر کہا کہ میرا وقت فضول باتوں میں ضائع نہ کریں۔ میری باتیں انھیں فضول معلوم ہوئیں۔ غور کیا جائے تو ہم اردو والے ہی اردو کے قاتل ہیں۔ سرکاری مراعات کے منتظر رہتے ہیں۔ خود کچھ نہیں کرتے۔ اگر کرنے کا موقع بھی ملتا ہے تو بدعنوانیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کچھ سیاسی لوگ اردو کو انتخابی ایشو بنا کر اس مظلوم زبان کی حمایت کرتے ہیں اور اس کی خوبیوں کے قصیدے پڑھتے ہیں۔ اور جب اقتدار مل جاتا ہے تو پھر ایک لفظ بھی اردو کے لیے نہیں بولتے، تُف ہے ایسے لوگوں پر۔"

"واقعی غزالی صاحب یہ تو آپ کا ظرف ہے ورنہ کون اپنی زبان، اپنے کلچر کے بارے میں سوچتا ہے آج کے ڈیٹ میں۔" پھر میں نے آسمان کا رنگ دیکھ کر کہا: "آج کافی بادل اُمڈ رہے ہیں۔ ہوائیں بھی تیز ہیں۔"

"جی ہاں —— اللہ خیر کرے۔ ایسا موسم تو میرے لیے ایک مصیبت ہے۔"

میں غزالی صاحب سے اجازت لے کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ اور دیر تک انھیں کے متعلق سوچتا رہا۔ طوفان دھیرے دھیرے تیز ہوتا جا رہا تھا۔ جیسے جیسے رات کے سائے پھیلتے گئے طوفان کی شدت میں اضافہ ہوتا گیا۔ ابھی پوری طرح صبح بھی نمودار نہیں ہوئی تھی کہ غزالی صاحب کے گھر سے شور بلند ہوا۔ میں دوڑتا ہوا ان کے یہاں پہنچا۔ وہاں جو منظر دیکھا وہ دل کو ہلا دینے والا تھا۔ ساری کتابیں لائبریری کے فرش پر بکھری پڑی تھیں۔ بارش کے پانی سے تربتر۔ غزالی صاحب ان بکھری ہوئی کتابوں پر منہ کے بل ہاتھ پیر پھیلائے ہوئے پڑے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا وہ ان تمام کتابوں کو اپنی گرفت میں لے کر بچانے کی کوشش کر رہے ہیں مگر ساری گیلی کتابیں ان کی پکڑ سے باہر ہو رہی ہوں۔ پہلے بھی ایسی طوفانی راتیں کئی ایک گزری تھیں، مگر آج کی طرح غزالی

صاحب ساکت و جامد نہیں ہوئے تھے۔ نہ جانے رات کی کس منحوس ساعت میں ان کی روح پرواز کرگئی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا وہ صرف غزالی صاحب کا ہی کتابوں کو اپنی گرفت میں لیتا ہوا ہاتھ نہیں تھا بلکہ اپنی زبان، اپنے کلچر سے محبت کرنے والے ہر اس شخص کا ہاتھ تھا جو اس کی بقا کے لیے جدوجہد کررہا ہو مگر کتابوں کی عبارتیں، اس کے الفاظ، اس کے حروف کاغذ کے پتوں سے اڑ اڑ کر آندھی کے ساتھ بادلوں میں تحلیل ہوتے جارہے ہوں اور ہمارے نحیف ہاتھ ہوا میں جھول رہے ہوں جسے بڑھ کر تھامنے والا کوئی بھی نہ ہو۔

اردو پر مَر مٹنے والے غزالی کو میں آخری سلام کہہ کر مایوس لوٹ آیا——

■❖■

اشاریہ

نیا موڑ	بیسویں صدی، دہلی،	جنوری ۱۹۷۰ء
گرتے گرتے	//	// اپریل ۱۹۷۰ء
اے غمِ دل کیا کروں	//	// مئی ۱۹۷۰ء
کب صبح ہوگی	//	// ستمبر ۱۹۷۰ء
روپ بہروپ	//	// نومبر ۱۹۷۰ء
گھر ہونے تک	//	// فروری ۱۹۷۱ء
زندگی کہاں گذرے	//	// مئی ۱۹۷۱ء
جاگتی آنکھوں کا خواب	//	// فروری ۱۹۷۲ء
پیار کی روح	//	// اپریل ۱۹۷۳ء
پتھر کی زبان	//	// جون ۱۹۷۴ء
نیا آدمی	//	// اکتوبر ۱۹۷۴ء
فیصلہ کا درد	ماہنامہ روشنی، میرٹھ،	جنوری ۱۹۷۴ء
واپسی	//	// اپریل ۱۹۷۴ء
بے گناہ	ماہنامہ جام نو، دھنباد،	جنوری ۱۹۵۹ء

دل ناداں	ماہنامہ زیور، پٹنہ، مئی ۱۹۶۹ء
چاند مدھم ہے	ماہنامہ عقاب، آسنسول، جنوری ۱۹۷۱ء
سب سے بڑی خوشی	مباحثہ، پٹنہ، اپریل تا جون ۲۰۰۶ء
نادانی	سب رنگ، ممبئی، دسمبر ۱۹۷۳ء
آندھی	شاعر، ممبئی

■❖■

اسی کتاب سے

......عشق و محبت کے معاملہ میں میرا نظریہ بہت رجعت پسندانہ ہے۔ میں ہوس کو محبت کا نام دینا محبت کی توہین سمجھتی ہوں۔ محبت تو ایک فطری جذبہ ہے جس کا اظہار اسے بالکل سطحی بنا دیتا ہے۔ میں تو خاموش محبت کی قائل ہوں......

روپ بہروپ

......موجودہ سماج کی تشکیل ہی کچھ اس انداز سے ہوئی ہے کہ غریب ہمیشہ ہی غریبی اور ناداری کی اندھیری رات میں سسکتا، بلکتا رہے گا............ بے کسی اور ناداری کی تاریک رات کبھی تو ختم ہوگی اور امیدوں کی سہانی صبح اپنی تمام تر تازگی، شگفتگی کے ساتھ کبھی تو جگمگائے گی............

کب صبح ہوگی

......میں وہ نہیں ہوں جو میں ہوں ـــــ میں وہ ہوں جو میں نہیں ہوں............ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ چنگیز اور ہلاکو اب بھی زندہ ہیں۔ مگر ہم امن چاہتے ہیں............

زندگی کہاں گذرے

......میں نے زندگی میں رسوائیوں کا ہی تو انتخاب کیا ہے۔ محبت ان رسوائیوں کو اپنی معراج سمجھتی ہے......

جاگتی آنکھوں کا خواب

............ڈائری کو زندگی کا بہترین ساتھی کہا گیا ہے، اس لیے کہ اس کے ہر صفحہ پر عہد ماضی مسکراتا رہتا ہے............ اس کی تمام باتیں حقیقت اور سچائی پر مبنی ہیں۔

دل ناداں

............اس مقام پر فرض اور وطن پرستی کا لبادہ کبھی جوانوں کے تن و من سے کوسوں دور تھا۔ ان تمام جوانوں کی آنکھوں میں جنسی ہوس کی سرخ سرخ چنگاریاں سلگ رہی تھیں............

چاند مدھم ہے

Jagti Ankhon Ka Khwab
Abul Lais Jawed